ISSN 0974-7346

ستمبر ۲۰۲۳ء

جلد ۲۱۰—عدد ۹

مجلس دارالمصنّفین کا ماہوار علمی رسالہ

دارالمصنّفین شبلی اکیڈمی اعظم گڑھ

DARUL MUSANNEFIN SHIBLI ACADEMY, AZAMGARH

سالانہ زر تعاون

ہندوستان	سالانہ ۳۵۰ روپے۔ فی شمارہ ۳۰ روپے۔ رجسٹرڈ ڈاک ۵۵۴ روپے۔ ۵ سال کی خریداری صرف ۱۵۰۰ روپئے میں دستیاب۔ لائف ممبر شپ ۱۰۰۰۰ روپے ہے۔
دیگر ممالک	رجسٹرڈ ہوائی ڈاک ۲۹۴۰ روپے۔ ہندوستان اور پاکستان کے درمیان ڈاک کا سلسلہ بند ہے۔ اس لئے فی الحال پاکستان معارف کی ترسیل موقوف ہے۔
بذریعہ ایمیل	اشتراک پی ڈی ایف بذریعہ ایمیل (ساری دنیا میں) ۳۵۰ روپے سالانہ۔

سالانہ چندہ کی رقم بینک ٹرانسفر، منی آرڈر یا بینک ڈرافٹ کے ذریعہ بھیجیں۔
بینک ٹرانسفر کر کے ہم کو ضرور اطلاع دیں۔ بینک اکاؤنٹ کی تفصیلات یہ ہیں:

Account Name: Darul Musannefin Shibli Academy
Bank Name: Punjab National Bank - Heerapatti, Azamgarh
Account No.: 4761005500000051 - IFSC: PUNB0476100

بینک ڈرافٹ درج ذیل نام سے بنوائیں:

Darul Musannefin Shibli Academy, Azamgarh

* زر تعاون ختم ہونے پر تین ماہ کے بعد رسالہ بند کر دیا جائے گا۔
* معارف کا زر تعاون وقت مقررہ پر روانہ فرمائیں۔
* خط و کتابت کرتے وقت رسالہ کے لفافے پر درج خریداری نمبر کا حوالہ ضرور دیں۔
* معارف کی ایجنسی کم از کم پانچ پرچوں کی خریداری پر دی جائے گی۔
* کمیشن ۲۵ فیصد ہوگا۔ رقم پیشگی آنی چاہئے۔

Office Mobile: 06386324437
Email: info@shibliacademy.org
Website: http://www.shibliacademy.org

ڈاکٹر فخر الاسلام اعظمی (ڈپٹی ڈائرکٹر) نے معارف پریس میں چھپوا کر دار المصنّفین شبلی اکیڈمی اعظم گڑھ سے شائع کیا۔

دارالمصنّفین شبلی اکیڈمی کا علمی و دینی ماہنامہ

معارف

جلد نمبر ۲۱۰ | ماہ صفر المظفر ۱۴۴۵ھ مطابق ماہ ستمبر ۲۰۲۳ء | عدد ۹

دارالمصنّفین شبلی اکیڈمی
پوسٹ بکس نمبر: ۱۹
شبلی روڈ، اعظم گڑھ (یوپی)
پن کوڈ: ۲۷۶۰۰۱
info@shibliacademy.org

فہرست مضامین

شذرات

ملک کی آزادی کے بعد ملکی سیاست کے نشیب و فراز غیر متوقع نہیں تھے، مختلف سماجی اور معاشی نظریات کے فروغ اور آئین ہند میں ان کی اہمیت اور برتری کی کوششوں سے عام زندگی میں ہلچل ہونی ہی تھی، لیکن کچھ باتیں مذہبی، علاقائی اور لسانی انتشار کا سبب بننے کی وجہ سے دور بیں اور دوراندیش ذہنوں کے لیے باعث تشویش بھی تھیں، آزادی کے سورج کے طلوع ہونے کی مسرت اور اس کی فضا کی تازگی جوں جوں حدت و حرارت میں بدلتی گئی، نظریات نے مزعومات اور تحدیات کی شکل اختیار کر لی، نتیجہ یہ ہوا کہ فسادات، قتل عام میں اور آئینی حقوق، تعددی غلبہ کے دباؤ میں آتے اور بدلتے چلے گئے، پھر بھی کہیں کہیں ظلم کے خلاف آواز اور دادرسی کی امید کی کرنیں نظر آتی تھیں، لیکن گذشتہ قریب دس سالوں میں پورے ملک میں اور اس سے پہلے چند ریاستوں میں جس طرح ایک ہنگامہ برپا کیا گیا اور جگہ جگہ ناہموار ذہنوں کو مذہبی مراق میں مبتلا کیا گیا، اس کا اندازہ شاید سیاست کے بڑے سے بڑے ماہر کو بھی نہیں تھا، اب تو یہ حال ہے کہ بس سب کی زبان پر ایک ہی سوال ہے کہ ہنگامہ ہے کیوں برپا؟

***

سوال دراصل شکست کی آواز ہے ورنہ جواب زیادہ پیچیدہ اور مشکل نہیں۔ زمین پر کسی فساد اور بگاڑ اور معاشروں اور تہذیبوں کی بربادی میں بنیادی وجہ ہمیشہ سے انسان کی بدعملی اور غلط اندیشی رہی ہے۔ عددی تفوق سے فرقوں کا جنم ہی نہیں ہوتا ان میں وہ احساس پندار بھی تیزی سے پنپتا ہے جس کی سب سے بڑی وجہ جہل اور تکبر ہے اور جس کا مقصد محض ایک فرد یا اس کے محدود نظریاتی دائرہ کا دوسروں پر غیر اخلاقی اور غیر دستوری تسلط اور استحصال ہے، ملک عزیز میں اس وقت ہر روز بلکہ ہر لمحہ ایک ایسی فضا کا احساس ہوتا ہے جس میں تباہ کن جراثیم پوری طرح شامل ہو چکے ہیں، جس میں دور ہی سے سماجی تعفن کی بدبو محسوس کی جاتی ہے۔ تعفن کے اس ڈھیر کو جب لگانا شروع کیا گیا تو ہندوستان کی سنجیدہ اور نہایت شائستہ زبانوں سے بدرجہ مجبوری اس قسم کے الفاظ نکلے کہ یہ فخر تنہا ہندوستان کو حاصل ہے کہ یہاں مسلم دشمنی کے لیے مستقل جماعتیں قائم ہیں، یہ جماعتیں علاقائی مفادات کے لحاظ سے کئی نام رکھتی ہوں لیکن کام میں سب میں اتحاد و اشتراک ہے اور کام صرف یہ ہے کہ مسلمانوں کو مٹانا ہے۔ نصف صدی پہلے ہندوستانیوں کی ایک نسل آزادی اور حریت اور احترام آدمیت اور یک جہتی کے تصور کی اہمیت سے کچھ واقف تھی، اس لیے نفرت کی کامیابی کا کوئی امکان نہیں تھا۔ مگر شر و فساد کی سنگینی کو کم سمجھنے کی

جس غلطی کا ارتکاب ہوا اس کا انجام سامنے آنا ہی تھا۔ اب صرف ایک مہینے اور وہ بھی آزادی ہند کے مہینے کی خبروں کو دیکھا جائے تو میوات سے منی پور تک اور الور سے ممبئی تک نگاہوں کے سامنے ایک رقص شرر ہے۔ عدالتوں میں مسلمہ قوانین سے ناجائز گنجائشوں کے ذریعہ بنارس کی شاہی جامع مسجد، متھرا کی قدیم مسجد اسی طرح فیض آباد کی پرانی اور نہات خوبصورت مسجد پر یلغار ہے، عدالتی احکام اگر کچھ ہیں بھی تو سر عام ان کی پامالی کو حکومت اور انتظامیہ کی شہ مل جاتی ہے حد یہ ہے کہ تلنگانہ میں حیدر آباد کی کئی قدیم تاریخی مسجدوں کا انہدام ہوا اور بظاہر اقلیتوں کی ہمدرد پارٹی کے زیر نگرانی ہوا۔ صدیوں سے چلے آرہے ایک تکثیری معاشرہ میں سماجی اور معاشی بائیکاٹ کی مسلسل جارحانہ اور ظالمانہ حرکتوں پر توجہ کیا دی جاتی جو اصل اور سامنے کے مجرم ہیں ان کو صاف بری الذمہ قرار دے کر گویا ظلم کو قانونی جواز عطا کر دیا جاتا ہے۔ حد یہ ہے کہ منی پور کے وحشیانہ اور بہیمانہ گناہوں پر جب بڑی مشکل سے پارلیمنٹ میں مذاکرہ و محاسبہ کے لیے وقت ملتا ہے تو وہاں ایک نہایت معمولی سی بات سے منی پور کے ذکر ہی کو بھلا دیا جاتا ہے۔ جن کی نگاہیں ان شاطروں کی اصل نیت اور غرض پر ہیں، سارے شور و شر میں کوئی ان کی آواز سننے والا نہیں کہ مقصد تو محض ایک محدود طبقہ کو مذہبی اور معاشی سرمایہ کا فائدہ پہنچانا ہے، ملک کی بڑی اقلیت تو ایک بہانہ ہے ورنہ ہر مذہبی اور لسانی اور فکری طبقے کو صرف دولت ہی نہیں ہر قسم کے افلاس سے دوچار کرنا ہے جس کے بعد سماجی حاکمیت تو دور کی بات ہے سماجی برابری کی فکر بھی ذہن کے کسی گوشہ میں جگہ نہ پاسکے۔ اب یہ باتیں محض نکتہ آفرینی کی نہیں ایک حقیقت بن چکی ہیں، ایسے میں سب سے بڑا سوال اس قوم کے لیے ہے جس کے وجود پر فسطائی طاقتوں کے عروج کی عمارت بنتی جا رہی ہے، کمال ہے برسوں پہلے معارف میں کہا گیا تھا کہ اب یہ تنہا مسلمانوں کا نہیں بلکہ پورے ملک کا مسئلہ ہے اس لیے اگر جرأت و ہمت کے ساتھ ان کا مقابلہ نہ کیا گیا تو نہ صرف جمہوریت و سیکولرزم کا خاتمہ بلکہ ملک ٹکڑے ٹکڑے ہو جائے گا۔ یہ الفاظ آج کے ہندوستانی مسلمان کے لیے سب سے زیادہ فکر و توجہ کے مستحق ہیں۔ اب معاملہ چند حقوق کے حصول اور جانبدارانہ رویوں پر صدائے احتجاج بلند کرنے کا نہیں ہے، یہ ملک اور اس کے باشندوں کو بربادی سے بچانے کا وقت ہے۔ جماعت سازی بلکہ ملک کی جمعیتی قوت کا ارتکاز مسئلے کا ایک حل ضرور ہے لیکن اہل نظر کا یہ تجرباتی تجزیہ بھی ہے کہ جماعتیں صرف جذبات، جوش و خروش اور ہنگاموں سے نہیں بنتیں۔ کامیابی اور کامرانی کے لیے اتحاد اتنا آسان بھی نہیں کیوں کہ یہ ایک نعمت ہے جو اختلاف، افتراق اور انتشار کے عذابوں سے چھٹکارے کی شکل میں ملتی ہے۔ جو دلوں کو جوڑ کر اخوت کی لذت و عزت سے ہمکنار کرتی ہے۔ سارے فلسفے ایک طرف اور

یہ حقیقت ایک طرف کہ مقصد کی بلندی اور اس سے عشق نما وابستگی کے لیے اعلیٰ اخلاق، پختہ سیرت اور مضبوط کردار اگر ہے تو کامیابی ورنہ نتیجہ معلوم۔ ہاں وحشیوں کو تخت و تاج پر قابض اور نشۂ اقتدار میں مدہوش دیکھ کر اگر ناامیدی دیکھی جائے تو تاریخ سے سبق اور سہارا دونوں ملتے ہیں کہ ایسا برابر ہوا کہ کسی فاتر العقل اور وحشی مزاج فرد یا جماعت نے اپنی طاقت یا جھوٹ اور فریب سے کسی مقصد کو حاصل کر لیا ہو۔ لیکن اخلاق و کردار اور موجودہ حالات کی مناسبت سے ظرف سے تہی مایہ ہونے کی وجہ سے یہ اقتدار دیر پا تو نہیں ہو سکتا اس لیے خوف کے ماحول میں ہراساں ہونے کی نہ ضرورت ہے نہ جواز۔ مسئلہ صرف ایک اقلیت کا نہیں پورے ملک کے تحفظ کا ہے۔ آزادی کے ۷۵ سال بعد غریبی، مہنگائی، بے روزگاری، تعلیم، صحت، زراعت، تجارت میں جن مسائل بلکہ مصائب کا انبار لگا دیا گیا ہے۔ دورِ آزادی کی رحمت جس طرح زحمت میں بدل دی گئی ہے اس کے ادراک میں بعض تحفظات کے ساتھ دوسرے برادران وطن کے ساتھ عام اور وسیع اتحاد کی اہمیت غور کرنے کی دعوت تو دیتی ہی ہے۔

***

اس خبر نے ہر شخص کو اداس کر دیا کہ ممبئی میں مولانا گلزار اعظمی نے اس دنیائے فانی کو الوداع کہہ دیا۔ ان کا وطنی تعلق اعظم گڑھ سے تھا لیکن مرکز عمل ان کے لیے ممبئی شہر بنا، جمعیۃ العلماء سے وابستہ ہو کر انہوں نے خدمت خلق کو اپنا شعار بنایا اور جب ملک میں بے گناہ اور بے قصور مسلمانوں کی گرفتاری اور ان کو زندانی بنانے کا فسطائی عمل شروع ہوا تو انہوں نے جمعیۃ العلماء کے ایک شعبہ کو قانونی امداد کا نام دے کر بے مثال محنت کی اور اسیروں کی رہائی کے لیے اپنی ساری توانائی صرف کر دی کبھی قوم کو احسان شناسی کی توفیق ہوگی تو وہ گلزار صاحب کو بہت یاد کرے گی۔ ۹۰ سال کی عمر میں بھی اسیروں کو رہائی دلانے کے عمل میں جوانوں کی سی ہمت و طاقت تھی۔ وہ تو اب نہیں ملیں گے، دعا یہی کہ رب العزت ان کا نعم البدل قوم کو عطا فرمائے۔ اور ان کی قربانیوں اور پاک کاوشوں کو قبول فرما کر اپنے دامن رحمت میں جگہ دے۔ آمین!

***

مقالات

ڈاکٹر محمد رفیع الدین کی کتاب قرآن اور علمِ جدید

ڈاکٹر محمد انظر ندوی

اسوسی ایٹ پروفیسر، شعبۂ مطالعاتِ عربی، انگلش اینڈ فارن لینگویجز یونیورسٹی، حیدرآباد

itsanzar@gmail.com

علامہ اقبال، جو دینی علوم اور علوم جدیدہ میں یکساں دسترس رکھتے تھے، ''دامِ فرنگ'' سے بچتے ہوئے حکمتِ افرنگ کا دانہ حاصل کرنے میں کامیاب ہوگئے۔ انہوں نے سائنسی اور مذہبی افکار میں اپنی کامیاب تالیفی کوششوں سے حکمتِ افرنگ کی آگ کو گلزار ابراہیم بنالیا۔ انہیں پختہ یقین تھا کہ وقت گذرنے کے ساتھ ساتھ سائنس اور مذہب کے درمیان ایسی ہم آہنگیوں کا انکشاف ہوتا جائے گا جس سے اسلام کی حقانیت دنیا پر منکشف ہوتی جائے گی اور زیادہ سے زیادہ بہتر نظریات سامنے آتے جائیں گے جو قرآنی حقائق کی تائید و تصدیق کریں گے۔

علامہ اقبال کی اس فکری روایت کو جس کا خلاصہ انہوں نے اپنی شہرہ آفاق کتاب ''خطبات'' کی شکل میں چھوڑا، اگر کسی دوسرے مسلمان مفکر نے آگے بڑھانے کی کوشش کی ہے، تو وہ ڈاکٹر رفیع الدین مرحوم ہیں۔ ڈاکٹر محمد رفیع الدین (۱۹۰۱ء۔۱۹۶۹ء) ان نابغۂ روزگار شخصیتوں میں سے ہیں جنہوں نے علم و فکر کی دنیا میں ایک الگ اور ممتاز مقام حاصل کیا ہے۔ علامہ محمد اقبال کے بعد علم و فکر کے افق پر جن چند افراد کا نام نمایاں ہے ڈاکٹر صاحب ان میں سرِ فہرست ہیں۔ برصغیر ہند و پاک کی ملتِ اسلامیہ کی نشاۃ ثانیہ کی جدوجہد میں ڈاکٹر صاحب کا شمار اہم ترین مفکرین میں ہوتا ہے۔

کشمیری الاصل علامہ محمد اقبال مفکرِ خودی ہیں اور ان کے ایک فکری جانشیں اور مفسرِ خودی ڈاکٹر محمد رفیع الدین بھی کشمیر کی عطا ہیں۔ اقبال کے اجداد کشمیر سے ہجرت کر کے پنجاب میں آباد ہوئے اور ڈاکٹر محمد رفیع الدین کا خاندان پنجاب سے اُٹھ کر کشمیر میں جا کر آباد ہوا، اقبال کی عظمت کو بین الاقوامی سطح پر تسلیم کیا گیا ہے اور اقبال شناسی کی روایت میں ''حکمتِ اقبال'' کے مصنف ڈاکٹر محمد رفیع الدین کی کاوشوں کو بھی قدر و منزلت کی نگاہ سے دیکھا جاتا ہے۔ ''خطبات'' (یعنی تشکیل جدید الٰہیات اسلامیہ)

کے مصنف، اقبال مفکر و فلسفی تھے اور ''آئیڈیالوجی آف دی فیوچر''، ''قرآن اور علم جدید''، ''اسلام اور سائنس'' کے مصنف ڈاکٹر محمد رفیع الدین بھی فکر و فلسفہ کے غواص تھے، ان دونوں ہستیوں کی زندگی میں دیگر علمی مماثلتوں کے علاوہ کشمیر بھی ایک مشترکہ حوالہ ہے، جس کی نسبت سے کشمیر کو ہمیشہ اپنے ان فرزندوں پر ناز رہے گا۔ ڈاکٹر سید عبداللہ لکھتے ہیں:

> ڈاکٹر محمد رفیع الدین صاحب اُن اہل علم میں سے ہیں جن کے پاس علم قدیم بھی اور علم جدید بھی اور اس کے ساتھ ہی ان کے دل میں اسلام کے لیے بے کراں محبت بھی ہے۔ وہ اسلام کو دور حاضر کے علوم و معارف کی اصطلاحوں میں پیش کرنے کا فن جانتے ہیں اور جدید مغربی و مشرقی مستشرقین کے طریق کار سے واقف اور اُس کے ناقد بھی ہیں۔ اس کا ثبوت ان کے اُس مقالے سے بخوبی ملتا ہے جو انہوں نے ۱۹۵۶ء کی اورینٹل کانفرنس لاہور میں بزبان انگریزی پڑھا تھا اور اب اردو میں پیش کیا ہے، اس کا موضوع ہے ''اسلامی تحقیق کا مفہوم، مدعا اور طریق کار''۔[1]

مصنف کے حالاتِ زندگی:

ڈاکٹر صاحب کی زندگی میں سائنس، ادب اور فلسفہ کا حسین امتزاج نظر آتا ہے۔ انہوں نے میٹرک اور انٹر کی سطح تک سائنس پڑھی۔ بی اے میں ان کے مضامین معاشیات اور عربی تھے۔ انہوں نے فارسی میں بی اے (آنرز) کرنے کے بعد ۱۹۲۹ میں پنجاب یونیورسٹی، لاہور سے عربی زبان و ادب میں ایم اے کیا۔ ایف ایس سی میں وہ نان میڈیکل کے طالب علم تھے۔ بعد میں ان کو پی ایچ ڈی Ideology of The Future کے عنوان پر اور ڈی لٹ بہ عنوان First Principles of Education پنجاب یونیورسٹی لاہور سے عطا ہوئیں۔ انہوں نے تاعمر قرآن اور دینی علوم کا گہرا مطالعہ کیا۔ اقبال کی شاعری اور ان کے فکر و فلسفہ سے ان کو عشق کی حد تک لگاؤ تھا، جو بقول ان کے ان کی بیشتر علمی تصنیفات کا محرک بھی ہے۔ اس متنوع علمی پسِ منظر کی بدولت ان کا اسلوبِ تحریر گہرا فلسفیانہ اور وسعت کا حامل ہے۔
دورانِ ملازمت، ۱۹۴۹ میں ان کی فلسفیانہ تصنیف Ideology of The Future پر انہیں پی ایچ ڈی کی ڈگری دی گئی۔ اس کے ممتحن ڈاکٹر رادھا کرشنن، پروفیسر ولیم للی اور سید ظفر الحسن مقرر ہوئے۔ کلیم اختر کے مطابق ڈاکٹر رادھا کرشنن نے اعتراف کیا کہ یہ مقالہ علمی دنیا میں ایک ٹھوس اضافہ ہے،

---

[1] ڈاکٹر سید عبداللہ، سابق پرنسپل یونیورسٹی اورینٹل کالج لاہور: تقریظ بر ''اسلامی تحقیق کا مفہوم مدعا اور طریق کار''، دار الاشاعت الاسلامیۃ، لاہور، اپریل ۱۹۶۹۔

پروفیسر للی نے اس کو فرائڈ، ایڈلر، کارل مارکس اور میکڈوگل کے نظریات کا حتمی ابطال قرار دیا، جب کہ سید ظفر الحسن کی رائے یہ تھی کہ آج تک فلسفہ کی کوئی کتاب ان کی نظر سے ایسی نہیں گزری جو اسلام کے اس قدر قریب ہو۔[۲]

وہ ۱۹۲۷ سے ۱۹۳۲ تک سری پرتاب کالج، سری نگر میں عربی اور فارسی کے پروفیسر رہے، پرنس آف ویلز کالج، جموں میں بھی ۱۲ سال تک تدریس کے شعبہ سے وابستہ رہے اور ۱۹۴۵ سے ۱۹۴۷ تک سری کرن سنگھ جی انٹر کالج، میر پور (جموں و کشمیر) کے پرنسپل رہے۔ تقسیمِ ہند کے ہنگاموں کی وجہ سے گورنمنٹ انٹر میڈیٹ کالج، میر پور بند ہو گیا تو ڈاکٹر صاحب لاہور منتقل ہو گئے اور یہیں سے پاکستان کے علم و ادب کے حلقہ میں ان کا سفر شروع ہوتا ہے۔ ۱۹۴۸ سے ۱۹۵۳ تک لاہور میں محکمہ اسلامک ری کنسٹرکشن اور انسٹی ٹیوٹ آف اسلامک کلچر میں ریسرچ آفیسر رہے۔ ۱۹۵۳ سے ۱۹۶۵ تک اقبال اکیڈمی، کراچی کے ڈائریکٹر رہے۔ ۱۹۶۵ میں فرسٹ پرنسپلز آف ایجوکیشن پر مقالہ پیش کرکے ڈاکٹر آف لٹریچر کا اعزاز حاصل کیا۔ ۱۹۶۶ سے ۱۹۶۹ تک ڈائریکٹر آل پاکستان اسلامک ایجوکیشن کانگریس، لاہور کی ذمہ داریاں نبھائیں۔ ۱۹۶۹ میں ۶۵ برس کی عمر میں کراچی میں ٹریفک کے ایک حادثے میں داعی اجل کو لبیک کہا اور سیالکوٹ میں دفن کیے گئے۔[۳]

ڈاکٹر محمد رفیع الدین کی زندگی علم کی تلاش اور جستجو سے عبارت تھی۔ انہوں نے اپنے علمی منصوبوں کے راستے میں نہ ذاتی مفادات، نہ خواہشات اور نہ بے جا مخالفتوں کو رکاوٹ بننے دیا اور ہمیشہ اپنے اعلیٰ آدرشوں اور مقاصد کے حصول کے لیے کوشاں رہے۔ اس بات کی گواہی ان کے معاصرین بشمول سید ابوالاعلیٰ مودودی، مولانا عبد الماجد دریابادی، مولانا ابوالحسن علی ندوی، ڈاکٹر اسرار احمد اور دیگر

---

[۲] کلیم اختر: اقبال اور مشاہیر کشمیر (باب علامہ اقبال اور ڈاکٹر محمد رفیع الدین) اقبال اکادمی پاکستان، لاہور، ۱۹۹۷ء، ص ۱۶۹، بحوالہ محمد شفیق عجمی: اقبال شناسی کی روایت میں ڈاکٹر محمد رفیع الدین کا مقام، (پی ایچ ڈی کا تحقیقی مقالہ)، شعبۂ اردو، جی۔سی یونیورسٹی، لاہور، ۲۰۰۳، ص ۲۶۔ repository.pastic.gov.pk/jspui/handle/123456789//3670

[۳] پروفیسر محمد عارف خان: ڈاکٹر محمد رفیع الدین مرحوم۔ شخصیت و فکر۔ ایک جائزہ (مقالہ)، ص ۱۵۔۱۶۔ یہ مقالہ ڈاکٹر رفیع الدین فاؤنڈیشن کے تحت drrafiuddin.com پر info@drrafiuddin.com کے پتے کے ساتھ ۲۰ مئی ۲۰۲۰ کو انٹرنیٹ پر اپلوڈ کیا گیا ہے۔ نیز یہ انٹرنیٹ کے دیگر مقامات پر بھی دستیاب ہے۔ چند جگہوں پر یہ مضمون پی ڈی ایف کی شکل میں بھی موجود ہے جو صفحہ ۱۶ سے شروع ہو کر صفحہ ۳۰ پر ختم ہو جاتا ہے، امر یقینی ہے کہ یہ کسی مجلے کا حصہ ہے، مگر مجلے کی تفصیل موجود نہیں ہے۔

اصحاب نے دی ہے۔ مولانا عبدالماجد دریابادی نے نہ صرف ''معاصرین'' میں ڈاکٹر رفیع الدین کو جگہ دی، بلکہ ان کے ساتھ ہونے والی اپنی ملاقات کو بھی ہمیشہ یاد رکھا۔ وہ لکھتے ہیں: ''۱۹۵۵ میں کراچی میں ملاقات ہوئی اور مل کر جی بڑا خوش ہوا کہ کم سے کم ایک آدمی تو ذہنی و دماغی قُویٰ میں فرنگیوں کا ہم پلہ موجود ہے، اقبال کے بعد سہی، جو اقبال کے کام اور پیام کو دنیا تک پہنچا سکتا اور اقبال ہی کی زبان اور لہجے میں گفتگو کر سکتا ہے''۔[۴] ڈاکٹر صاحب درویش مزاج انسان تھے، طبیعت میں سوز و گداز تھا، ذکرِ خدا پر بہت زور دیتے تھے۔ سلسلۂ طریقت میں مفتی محمد حسن سے بیعت تھے۔ اپنی اصلاح و روحانی ترقی کے لیے اپنے مرشد سے باقاعدہ ہدایات لیا کرتے تھے۔ خود فرمایا کرتے کہ ذکر کی برکت سے بہت اچھے اچھے خیالات خود بخود سوجھتے ہیں اور معمولی سی کوشش سے علمی حقائق منکشف ہو جاتے ہیں اور انسان کے لیے تھوڑا سا مطالعہ بھی کفایت کر جاتا ہے۔[۵]

ان کے حلقۂ احباب میں سے کچھ لوگ ان کے مزاج کی شدت پسندی کا بھی ذکر کرتے ہیں، یہاں تک کہ ان کو مذہبی لحاظ سے ایک متشدد قسم کا انسان بھی کہا گیا۔ وہ اپنے موقف پر سختی سے قائم رہتے۔ اسلام اور سوشلزم ایک ایسا موضوع ہے جسے ان کی دکھتی رگ کہنا چاہیئے۔ وہ بالکل ابتدا میں اپنے ملک میں سوشلزم کا نعرہ بلند ہوتے دیکھ کر سخت دل گرفتہ اور رنجیدہ ہوئے۔ ادارہ ثقافتِ اسلامیہ، لاہور کی ملازمت کے دوران ان کو خلیفہ عبدالحکیم جیسی شخصیت کے ساتھ کام کرنے کا موقع ملا۔ لیکن بقول پروفیسر عثمان ان دونوں کے درمیان حقیقی مساوات کبھی قائم نہ ہو سکی۔[۶] اس کی ایک وجہ شاید یہ بھی رہی ہو کہ خلیفہ عبدالحکیم بھی اسلامی سوشلزم کے بارے میں لکھنے والے روشن خیالوں میں شامل تھے۔

ڈاکٹر محمد رفیع الدین کی شخصیت اور ان کے خیالات کو سمجھنے کے لیے پروفیسر مرزا محمد منور کا ایک جملہ بہت اہم ہے، جو انہوں نے ''حکمتِ اقبال'' پر اپنے تاثرات کا اظہار کرتے ہوئے لکھا: ''ڈاکٹر رفیع الدین صاحب مزاجاً بھی اور عملاً بھی، شدید مذہبی آدمی تھے، اسلام کی حقانیت پر بھرپور یقین تھا اور اس امر پر ایک طرح سے ایمان محکم رکھتے تھے کہ ہر سائنسی اور علمی اور نظری ترقی کسی نہ کسی اعتبار سے اسی

---

[۴] مولانا عبدالماجد دریابادی: معاصرین، ترتیب حکیم عبدالقوی دریابادی، گلوب پبلشرز، لاہور (تاریخ اشاعت ندارد، البتہ ہندوستان میں یہ کتاب ۱۹۷۴ میں شائع ہوئی)، ص ۲۰۷۔

[۵] پروفیسر محمد عارف خان: ڈاکٹر محمد رفیع الدین مرحوم۔ شخصیت و فکر۔ ایک جائزہ (مقالہ)، ص ۱۶۔

[۶] روزنامہ ''نوائے وقت''، لاہور، ۱۲ دسمبر ۱۹۶۹ء۔

نقطے کی طرف ایک قدم ہے جسے نقطۂ توحید کہتے ہیں''۔[۷]

مولانا عبد الماجد دریابادی نے اپنی کتاب ''معاصرین'' میں تحریر کیا ہے کہ ''بڑے ہی پُر جوش دیندار قسم کے مبلغ و مفکر۔ ان کا بس چلتا تو ساری دنیا کو مسلمان کر ڈالتے، کم سے کم تبلیغ تو سب ہی کو کرتے رہتے''۔ڈاکٹر محمد رفیع الدین علوم جدید کی اسلامی تشکیل کو تعلیم کی سب سے اہم ضرورت قرار دیتے ہوئے سائنسی نصابات کو نئے سرے سے مرتب کروانے کو ضروری خیال کرتے تھے۔اسلامک ایجوکیشن کانگریس کا قیام بھی اسی سلسلے کا ایک بنیادی اقدام تھا۔ان کی زندگی کے آخری چار پانچ سال اسی جد وجہد میں گذرے۔ وہ مذہب اور سائنس کے اتحاد کے سلسلہ میں نہایت سنجیدہ تھے، مولانا عبد الماجد دریابادی کے بقول ''سارے ہندوستان و پاکستان میں ایک شخص تو ایسا نظر آیا تھا جو علوم عقلیہ کو مسلمان بنا رہا تھا''۔[۸]

پروفیسر محمد عارف خان لکھتے ہیں:

> ڈاکٹر صاحب نے کئی موضوعات پر قلم اٹھایا، بنیادی طور پر ان کی فکر و تحریر کا محور دورِ جدید میں اسلام کی تعبیر و تشریح کے حوالے سے درپیش مشکلات کا تدارک تھا، وہ ایک سائنسی فارمولے کی دریافت کے آرزومند تھے، جو ہر دور کے تقاضوں کے مطابق اسلام کی تعبیر و تشریح کرنے میں ممد و معاون ثابت ہو، اسلام کی تائید وحمایت اور باطل کی تردید ان کا موضوع رہا ہے، اسلامی عقائد و افکار کا فلسفیانہ محاذ پر دفاع، نظریۂ توحید کا افکار وعلوم کی بنیاد قرار دینے، فکرِ اقبال کی ترقی و ترویج، قرآنی علوم و تعلیمات کا جدید علوم سے موازنہ، باطل علوم کی تردید اور سچے علوم کی تصدیق ان کے دائرہ ہائے تحریر ہیں۔[۹]

ان کی تصانیف میں ''آئیڈیالوجی آف دی فیوچر''، ''قرآن اور علمِ جدید'' اور ''حکمتِ اقبال'' اہم کتابیں ہیں۔ ان تصنیفات کے بارے میں دیباچہ حکمتِ اقبال میں وہ خود رقمطراز ہیں: ''جو احباب اقبال کے فلسفۂ خودی کا یا اسلام کا مطالعہ ایک خالص اور منظم فلسفہ یا سائنس کے طور پر کرنا چاہتے ہیں، وہ میری

---

[۷] سہ ماہی ''اسلامک ایجوکیشن''، لاہور، اکتوبر نومبر دسمبر ۱۹۷۰، ص ۱۰۹۔۱۱۰، بحوالہ محمد شفیق عجمی: ص ۴۹۔
[۸] مولانا عبد الماجد دریابادی: معاصرین، ص ۲۰۷۔
[۹] مضمون ''ڈاکٹر محمد رفیع الدین مرحوم: شخصیت و فکر: ایک جائزہ''۔ یہ مقالہ ڈاکٹر رفیع الدین فاؤنڈیشن کے تحت drrafiuddin.com پر info@drrafiuddin.com کے پتے کے ساتھ ۲۰ مئی ۲۰۲۰ کو انٹرنیٹ پر اپلوڈ کیا گیا ہے۔

کتاب آئیڈیالوجی آف دی فیوچر کا مطالعہ مفید پائیں گے اور جو فلسفۂ خودی کا مطالعہ اسلام کے ایک فلسفہ کے طور پر کرنا چاہتے ہیں، وہ میری کتاب ''قرآن اور علمِ جدید'' کا مطالعہ دلچسپی کا باعث پائیں گے اور جو فلسفۂ خودی کا مطالعہ اقبال کے حوالوں کی روشنی میں اقبال کے فلسفے کے طور پر کرنا چاہتے ہیں، وہ زیرِ نظر کتاب ''حکمتِ اقبال'' کا مطالعہ مدعا کے مطابق پائیں گے''۔ اس کے علاوہ ڈاکٹر صاحب کی اردو میں لکھی گئی تصنیفات میں پاکستان کا مستقبل، روحِ اسلام، اسلامی نظریۂ تعلیم، اسلام اور سائنس اہم کتابیں ہیں اور انگریزی زبان میں لکھی گئی اہم کتابیں یہ ہیں:

(۱) Manifesto of Islam
(۲) First Principles of Education
(۳) Fallacy of Marxism
(۴) The Meaning and Purpose of Islamic Research
(۵) Potential Contribution of Islam to World Peace

''قرآن اور علم جدید'' کا مطالعہ

''قرآن اور علمِ جدید'' ڈاکٹر محمد رفیع الدین کی ایک اہم اور معرکہ آراء تصنیف ہے، جسے علمی و ادبی اور دینی حلقوں میں بے حد سراہا گیا اور جو در حقیقت علامہ اقبال کی کتاب ''خطبات'' ہی کے سلسلے کی ایک دوسری کامیاب کوشش ہے۔ مصنف نے یہ کتاب ادارہ ثقافتِ اسلامیہ، پاکستان میں کام کرنے کے دوران قلمبند کی اور اس کے پہلے تین ایڈیشن اسی ادارے کی طرف سے شائع ہوئے، اس کا پہلا ایڈیشن ۱۹۵۱ء میں شائع ہوا۔ جب کہ تیسرا ایڈیشن ۱۹۵۹ء میں منظرِ عام پر آیا، چوتھا اور پانچواں ایڈیشن بالترتیب ۱۹۸۱ء اور ۱۹۸۶ء میں آل پاکستان اسلامک ایجوکیشن کانگریس، لاہور کی طرف سے شائع کیا گیا جو ۵۹۴ صفحات پر مشتمل ہے۔ ہمارے پیشِ نظر یہی آخری ایڈیشن ہے جس کے سرِ ورق پر کتاب کا عنوان ''قرآن اور علمِ جدید'' کے ساتھ ایک ذیلی عنوان ''یعنی احیائے حکمتِ دین'' بھی درج ہے۔ سرِ ورق پر ہی قرآن مجید کی آیت '' اِقرأ و ربک الأکرم، الذي علّم بالقلم، علّم الإنسان مالم يعلم'' (پڑھ اور تیرا رب بڑا کریم ہے جس نے انسان کو قلم سے علم سکھایا اور وہ باتیں سکھائیں جو وہ نہیں جانتا تھا) اور رومی کا یہ شعر مندرج ہے:

حکمتِ دنیا فنزاید ظن و شک
حکمتِ دینی بر وفوقِ فلک

عبد الماجد دریابادی نے اس کتاب پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھا ہے کہ ''کلامِ جدید پر کتابیں اردو میں ہر قسم اور ہر سطح کی لکھی جا چکی ہیں اور ان میں سے بعض بڑی فاضلانہ اور بڑی دلنشیں بھی ہیں، لیکن اس کتاب کی سطح ان سب سے بلند و ممتاز ہے''۔ کتاب کی فکری بلندی اور ثقل و وزن کا اندازہ اس بات سے لگایا جاسکتا ہے کہ مصنفِ کتاب ڈاکٹر محمد رفیع الدین نے جب تبصرہ کے لیے اسے عبد الماجد دریابادی کی خدمت میں بھیجا تو انھوں نے کتاب پر علی الفور تبصرہ نہ لکھا، بلکہ اس کے دقیق علمی مباحث کی تفہیم کے لیے بڑی تاخیر کی۔ وہ لکھتے ہیں: ''کتاب چند سال قبل کی شائع شدہ ہے، تبصرہ و تعارف کے لیے موصول ہوئے بھی کوئی دو سال ہو چکے اور اس تاخیر میں قصور تبصرہ نگار کی سستی، کاہلی، سہل انگاری کا اتنا نہیں، جتنا خود کتاب کی فکری بلندی اور علمی ثقل و وزن کا ہے، کتاب کے پڑھنے اور سمجھنے ہی میں ایک مدت لگ گئی اور پھر بھی کتاب کا ہر صفحہ و مقام فہم و ادراک کی گرفت میں نہ آسکا۔ مصنف اقبال اکیڈمی (کراچی) کے ڈائریکٹر ہیں اور ان کا قلم، شاعر اقبال نہیں، فلسفی اقبال (تشکیل جدید اسلام پر چھ لکچر والے اقبال) کے قلم کا جانشیں ہے''۔ شاید کتاب کی بلند علمی سطح کے پیشِ نظر ہی عبد الماجد دریابادی کو یہ بھی لکھنا پڑا کہ: ''کتاب عوام کے کام کی بالکل نہیں۔ صرف اونچے تعلیم یافتہ طبقہ کے مطالعہ کے قابل ہے، گو اس طبقے میں بھی کتاب کے ہر نکتہ کو سمجھنے والے شاذ و نادر ہی ملیں گے، آئن سٹائن کے نظریۂ اضافیت کو ہی سمجھنے والے شروع میں کہا جاتا ہے کہ گنتی ہی کے چند فرد تھے''۔

عبد الماجد دریابادی نے اپنے معاصرین میں اس کتاب کی سب سے زیادہ قدر کر سکنے کی صلاحیت رکھنے والے علمائے راسخین میں مولانا مناظر احسن گیلانی (جو بقول عبد الماجد دریابادی، شیوخِ دیوبندی میں شمار ہونے کے باوجود طبعاً و ذوقاً ندوی تھے) اور مولانا ابو الحسن علی ندوی کا نام لیا ہے، بلکہ کتاب کی غیر معمولی اہمیت اور قدر و قیمت کے پیشِ نظر ندوۃ العلماء کے اس وقت کے معتمدِ تعلیم مولانا ابو الحسن علی ندوی کو مشروط مشورہ بھی دیا کہ وہ اسے ندوہ کے نصاب میں داخل کر دیں۔

صاحبِ کتاب نے سائنسی اصول و نظریات کا بڑا گہرا اور راست مطالعہ کیا ہے، مزاجِ اسلام کے موافق نظریات کو قبول کیا ہے، اور مخالف آرا کا ردّ و ابطال پوری علمی دلیری اور استدلالی ہمت سے کیا ہے۔ مولانا عبد الماجد دریابادی رقمطراز ہیں: ''مصنف نے ادق سے ادق فلسفوں اور سائنسی اصول و نظریات کا (نہ کہ ان کے عوامی خلاصوں اور شرحوں کا) براہِ راست مطالعہ کیا ہے اور ان کے جواب میں سطحی اور ہنگامی دفع الوقتی کو کافی نہ پاکر ان کے گہرے چیلنج کو سمجھا ہے۔ ان جدید علوم کے جتنے اجزاء آیاتِ قرآنی کی روشنی میں، مزاجِ اسلام کے مطابق و ماتحت نظر آئے، انھیں قبول کر لیا ہے اور جتنے اس کے مخالف یا کم

سے کم اس سے خارج نظر آئے، ان کا ردّ و ابطال پوری علمی دلیری اور استدلالی ہمت سے کیا ہے۔ کتاب کا بیشتر حصہ اپنے استدلال کے استحکام اور دلائل منطقی و فلسفی کی گرفت کے لحاظ سے سارے کلامی ذخیرے میں اپنی نظیر آپ ہے''۔[۱۰]

کتاب ''قرآن اور علمِ جدید'' کی اہمیت کا اندازہ اس بات سے لگایا جاسکتا ہے کہ مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندوی نے اسی کتاب کو ابتدائی طور پر پڑھ کر ''ردّة جديدة'' اور ''دعوة جديدة'' کے عنوان سے ایک سلسلۂ مضامین تحریر کیا تھا جو دمشق کے اسلامی ماہنامہ ''المسلمون'' کے دو شماروں میں شائع ہوا۔ یہ مضمون'' ردّة ولا أبابكر لها'' کے عنوان سے عربی میں اور The New Menace and Its Answer کے نام سے انگریزی میں بھی شائع ہوا۔ ان مضامین کا ترجمہ اردو میں الفرقان، لکھنو کے مدیر مولانا عتیق الرحمن نے ۱۹۵۹ء میں ''نیا طوفان اور اس کا مقابلہ'' کے عنوان سے کیا۔ مولانا سید ابوالحسن علی ندوی کتاب کے پیشِ لفظ میں تحریر فرماتے ہیں: ''جدید ارتداد کی موجودہ نوعیت کی طرف توجہ ڈاکٹر رفیع الدین صاحب کی فاضلانہ کتاب ''قرآن اور علمِ جدید'' کے ابتدائی صفحات کو پڑھ کر ہوئی، جس میں بڑی خوبی کے ساتھ اس تخیل کو پیش کیا گیا ہے۔ راقم سطور نے بنیادی تخیل کو اپنے عربی مضامین میں (جس کا ترجمہ پیشِ نظر ہے) مزید تفصیل و توضیح اور اضافہ اور عملی تشکیل و دعوت کے ساتھ پیش کیا ہے اور اب وہ ایک موضوعِ فکر اور دعوتِ عمل کے طور پر سامنے ہے''۔[۱۱]

''قرآن اور علمِ جدید'' کو ایک تلخیص کی صورت میں محمد موسیٰ بھٹو نے پیش کیا ہے، جسے سندھ نیشنل اکیڈمی ٹرسٹ، حیدرآباد، پاکستان کی طرف سے نومبر ۲۰۰۲ء میں شائع کیا گیا ہے اور جس کے بارے میں ڈاکٹر غلام مصطفی خان مرحوم نے یہ رائے پیش کی تھی کہ محمد موسیٰ بھٹو صاحب نے اس کتاب کی تلخیص اور ذیلی سرخیوں کے ساتھ کتاب کے مواد اور اس کی عطر کو ان سرخیوں میں سمونے کی کوشش کر کے اہم خدمت سرانجام دی ہے، اس طرح اس اہم کتاب سے استفادہ کی عام صورت پیدا ہوگئی ہے۔[۱۲] کتاب کے ٹائٹل پر عنوان کے ساتھ مندرجہ ذیل عبارت بھی دی گئی ہے: ''ممتاز فلسفی کی

---

[۱۰] مولانا عبدالماجد دریابادی: قرآن اور علم جدید۔ مولانا ماجد کی نظر میں، ماہنامہ بیداری، سندھ نیشنل اکیڈمی ٹرسٹ، حیدرآباد، پاکستان، جلد سوم، شمارہ ۲۳، فروری ۲۰۰۵ء، ص ۳۱۔۳۵۔

[۱۱] مولانا سید ابوالحسن علی ندوی: پیشِ لفظ، نیا طوفان اور اس کا مقابلہ، مجلسِ تحقیقات و نشریات اسلام، ندوۃ العلماء لکھنو، بارِ سوم، ۱۴۳۰ھ/۲۰۰۹ء۔

[۱۲] صدقِ جدید، لکھنو، ۲۸/اگست ۱۹۵۹ء، بحوالہ محمد شفیق عجمی: ص ۵۹۔

طرف سے عالمِ اسلام کے دانشوروں، یونیورسٹیوں کے فضلا اور جدید طبقات کے لیے عظیم تحفہ"۔ کتاب کے تلخیص نگار محمد موسیٰ بھٹو نے کتاب کے آغاز میں "فکرِ اسلامی کا عظیم سرمایہ۔ایک مطالعاتی جائزہ" کے عنوان سے ٦٢ /صفحات کا ایک جامع تعارف بھی تحریر کیا ہے جس میں دنیائے اسلام کو درپیش فکری چیلنجوں کے تناظر میں ڈاکٹر محمد رفیع الدین کے افکار کو پیش کرنے کی کوشش کی ہے۔ ڈاکٹر محمد رفیع الدین کے صاحبزادے صلاح الدین محمود، مقیم کراچی ان دنوں "قرآن اور علمِ جدید" کے انگریزی ترجمے میں مصروف ہیں۔اس سے پہلے وہ ڈاکٹر مرحوم کی تصنیف "روحِ اسلام" کو The Essence of Islam کے عنوان سے ترجمہ کر چکے ہیں"۔[١٣]

"قرآن اور علمِ جدید" کے مباحث

قرآن اور علمِ جدید، دو حصوں (حصۂ اول: چیلنج، حصۂ دوم: جواب) پر مشتمل ہے۔ حصۂ اول (جو سو صفحہ تک چلا گیا ہے) میں ان ذیلی عنوانات (خطرناک فتنۂ ارتداد، نارِ فرنگ، تصوراتِ کفر کے فروغ کا واحد سبب، بے بسی کا عالم، انسدادِ ارتداد کا طریق) کے تحت بحث کی گئی ہے۔ قرآن مجید کی یہ آیت "يريدون ليطفئوا نور الله بأفواههم" (وہ چاہتے ہیں کہ اللہ کے نور کو اپنے منہ کی پھونکوں سے بُجھادیں) حصۂ اول کے صفحہ پر منقوش ہے۔ کتاب کا حصۂ دوم (جو تقریباً ۵۰۰ صفحات پر مشتمل ہے) چیلنج کا جواب ہے، مصنف نے مغرب کے ٦ بنیادی فلسفوں کو لے کر ان پر پورا عملِ تحلیل و تجزیہ کیا ہے اور یہ چھ ہمہ گیر و ہر جہتی فلسفے مختلف ابواب میں منقسم ہیں اور ان میں سے ہر باب متعدد تحتانی عنوانات میں تقسیم ہے اور ہر عنوان پر تشفی بخش علمی بحث موجود ہے، وہ ٦ فلسفے ذیلی عناوین کے ساتھ حسبِ ذیل ہیں:

(١) ڈارون ـــــ نظریۂ ارتقا (حقیقتِ ارتقا، سببِ ارتقا، قرآنی نظریۂ ارتقا)۔ (٢) میکڈوگل ـــــ نظریۂ جبلت (انسان کی فطرت کا قرآنی نظریہ، میکڈوگل کے لیے قرآن کی راہ نمائی)۔ (٣) فرائڈ ـــــ نظریۂ لاشعور (جنسیت) (حیات بعد الممات اور لاشعور)۔ (٤) ایڈلر ـــــ نظریۂ لاشعور (حسبِ تفوق) (٥) کارل مارکس ـــــ نظریۂ سوشلزم (اقتصادی مساوات اور اسلام، مارکس کا غلط فلسفہ، اقتصادی حالات اور جذبۂ حسن، بارآور قوتیں اور بارآور تعلقات)۔ (٦) میکیاولی ـــــ نظریۂ وطنیت (عقیدۂ وطنیت کی بیہودگی)۔

کتاب "قرآن اور علمِ جدید" کا انتساب بھی بہت معنی خیز ہے۔ اس کا انتساب "مستقبل کے انسان کے

---

[١٣] محمد شفیق عجمی: اقبال شناسی کی روایت میں ڈاکٹر محمد رفیع الدین کا مقام، ص ۵۹۔

نام ہے ''جو قرآنی نظریہ کائنات کے علاوہ ہر نظریہ کائنات کو عہدِ قدیم کی جہالت قرار دے گا۔ اور اس سے بھی بڑھ کر معنی خیز وہ آیتِ قرآنی مع تشریحی ترجمہ ہے جو اس انتساب کے معاً بعد درج ہے ''سنريهم آياتنا في الآفاق وفيّ أنفسهم، حتى يتبيّن لهم أنه الحق''(حم السجدة،٦)(عنقریب ہم ان کو نفسِ انسانی کے اندر اور خارج کی دنیا میں نشانات دکھائیں گے)(یعنی ان کی نفسیات، طبعیات اور حیاتیات کے بعض حقائق سے آشنا کریں گے)، حتی کہ ان پر ثابت ہو جائے گا کہ قرآن خدا کی سچی کتاب ہے)۔ ''قرآن اور علمِ جدید'' کا انتساب ''مستقبل کے انسان کے نام'' محض کتاب کا انتساب ہی نہیں، بلکہ مصنف کا وہ دعوی ہے جسے بنیاد بنا کر انہوں نے فکرِ مغرب بالخصوص ڈارون، میکڈوگل، فرائڈ، ایڈلر، کارل مارکس اور میکیاولی کے نظریات کا ابطال کیا ہے۔

کتاب کے اہم نکات

اس کے بعد مصنفِ کتاب نے ۴۰ صفحات پر مشتمل مفصل تعارف میں کتاب کے مندرجات پر تفصیلی بحث کی ہے۔ کتاب کے اہم نکات درج ذیل ہیں:

۱۔ مصنف نے یہ بڑی ہی گہری بات لکھی ہے کہ: ''اب تک علمائے اسلام کو مقابلہ مذہبوں سے کرنا پڑا تھا اور ان میں سے ہر باطل دین کے مقابلہ میں ہمارا دینِ حق غالب ہوتا گیا، لیکن اب پہلی بار آکر مقابلہ کسی دین یا مذہب سے نہیں، بلکہ باطل فلسفہ یا نظریاتِ کائنات سے پڑا ہے، جو یورپ کا اثر ہے اور جو رفتہ رفتہ سارے عالمِ اسلامی پر چھا گئے ہیں، جنہوں نے اندر ہی اندر ہمارے تمدن، ہمارے علوم، ہماری سیاست، سب ہی کو مسموم کر دیا اور جن کے اثر سے ہمارے لکھو کھا پڑھے لکھے افراد بہ ظاہر اسلام کے اندر رہ کر دل و دماغ کے لحاظ سے ارتداد اختیار کر چکے ہیں۔ میرے نزدیک اسلام کے انحطاط کی وجہ مغرب کے وہ غلط فلسفیانہ تصورات ہیں، جن کا اثر فضا میں چاروں طرف پھیل گیا ہے اور جن سے ہمارے تعلیم یافتہ طبقات مساوی طور پر متاثر ہوتے ہیں۔ ان تصورات نے زیادہ تر بالواسطہ اور غیر شعوری طور پر اپنا اثر پیدا کر کے اسلام کی محبت ہم سے چھین لی ہے، جیسے کہ ایک مخفی اور مزمن مرض کے جراثیم اندر ہی اندر ایک بھلے آدمی کی صحت اور طاقت کو سلب کر لیں اور اسے ناگہاں

معلوم ہو کہ وہ موت کے دروازے پر کھڑا ہے''۔[۱۴]

۲۔ مصنف ایک مفصل بحث کے بعد بالآخر اس نتیجہ پر پہنچے ہیں کہ ''یہ فتنۂ ارتداد اس وقت تک رک نہیں سکتا جب تک کہ ہم اس کے اصلی اور بنیادی سبب کا ازالہ نہ کریں، یعنی ان تصورات کی ذہنی جاذبیت کو ختم نہ کردیں۔ ان کی ذہنی جاذبیت اس وقت تک ختم نہیں ہوسکتی، جب تک کہ ہم طاقتور علمی دلائل اور عقلی براہین کے ساتھ چوٹی کے علما کے نزدیک ان کی فرضی معقولیت کا پردہ چاک نہ کردیں''۔[۱۵]

۳۔ ایک حیثیت سے یہ کتاب مغرب کے رائج الوقت ملحدانہ فلسفوں کی تردید ہے۔ قارئین دیکھیں گے کہ ڈارون کے فلسفے کے سوائے (جو انسانی نفسیات سے تعلق نہیں رکھتا، بلکہ نوعِ بشر کے جسمانی ارتقا کا نظریہ ہے) ان تمام فلسفوں میں قدرِ مشترک یہ ہے کہ وہ نصب العینوں یا آدرشوں کی محبت کو جو انسان کا ایک بنیادی وصف ہے اور انسان کے مذہبی، روحانی، علمی، اخلاقی اور سیاسی نظریات اور معتقدات کی شکل میں ظاہر ہوتا ہے، وہ اسے فطرت انسانی کا ایک مستقل اور پیدائشی تقاضا اور انسانی اعمال کی اصل نہیں سمجھتے، بلکہ اسے انسان کی بعض یا تمام حیوانی جبلتوں کا ضمنی یا اتفاقی نتیجہ قرار دیتے ہیں اور ڈارون کے حیاتیاتی نظریہ کی بنا پر ہم نفسیات انسانی کا جو تصور قائم کرنے پر مجبور ہیں اس کا بھی ایک ضروری حصہ یہ ہے کہ نصب العینوں کی محبت نہ تو فطرت انسانی کا ایک مستقل اور پیدائشی تقاضا ہے اور نہ ہی اس کے اعمال کی جڑ ہے، بلکہ کش مکشِ حیات کی ضروریات کا ایک اتفاقی نتیجہ ہے۔[۱۶]

۴۔ دوسری حیثیت سے اس کتاب کا مضمون اسلام کا نظامِ حکمت ہے اور اس نظامِ حکمت کا مرکزی تصور یہی نقطہ ہے کہ نصب العینوں کی محبت انسان کی فطرت کا ایک مستقل تقاضا ہے۔

۵۔ چوں کہ انسان کی اصل انسان کا شعور یا خود شعوری ہے جسے اقبال نے خودی کہا تھا، لہذا ہم اسے فلسفۂ شعور، فلسفۂ خود شعوری یا فلسفۂ خودی کہہ سکتے ہیں۔ پھر چونکہ انسان کی خودی

---

[۱۴] ڈاکٹر محمد رفیع الدین: قرآن اور علم جدید، تعارف بہ قلم مصنف، آل پاکستان اسلامک ایجوکیشن کانگرس، لاہور، طبع پنجم، دسمبر ۱۹۸۶ء، ص الف/۱۰۔

[۱۵] ماخذ سابق، ص الف، ۹۔۷۔

[۱۶] ماخذ سابق، ص ط/۱۷۔

کے تمام خواص اور اوصاف اس کی اس مرکزی خاصیت سے پیدا ہوتے ہیں کہ وہ ایک نصب العین سے محبت کرتا ہے اور اسی سے اپنا نظریۂ حیات اخذ کرتا ہے، لہذا ہم اسے نصب العینوں کا فلسفہ بھی کہہ سکتے ہیں، یہ وہی فلسفۂ خودی ہے جس کا آغاز اقبال نے کیا تھا، لیکن اس کتاب میں یہ فلسفہ نصب العینوں کے فلسفے کی صورت میں اپنی تنظیم اور تکمیل کو پہنچا ہے۔[۱۷]

۶۔ قصۂ تخلیقِ آدم کو مصنف نے تمثیلی قرار دیا ہے۔ وہ لکھتے ہیں ''قرآن میں پہلے انسان کے یکایک پیدا ہو جانے کا کوئی ذکر نہیں اور اس کے برعکس انسانی نسل کے تدریجی ظہور کے متعلق اس میں حسب ذیل شواہد موجود ہیں: ربٌّ (خدا) کی صفات میں سے ایک صفت ہے۔ ''الحمد للہ رب العٰلمین'' (سب تعریف اللہ کے لیے ہے جو تمام عالَموں کا رب ہے)۔۔۔۔ چونکہ اللہ تعالیٰ نے انسان کے اندر بھی اپنی صفات کا پرتو رکھا ہے، لہذا انسان کی تخلیق میں بھی تدریج اور تربیت کے اوصاف ہوتے ہیں اور وہ بھی اپنی تربیت میں اپنی تمام صفات جلال و جمال کا اظہار کرتا ہے۔ قرآن کا ارشاد ہے: ''هو الذي أنشأكم من الأرض'' (اللہ وہ ذات پاک ہے جس نے تمہاری نسل کو زمین سے پیدا کیا ہے)۔ اس آیت سے یہ بات ذہن میں آتی ہے کہ انسان کا زمین سے پیدا ہونا اسی طرح سے تھا جس طرح نباتات کا زمین سے اُگنا''۔[۱۸]

اقبال ''خطبات'' میں ہبوطِ آدم کے قرآنی قصے کی تعبیر کرتے ہوئے اسے اپنے آزادی اور اختیار کے تصور سے ہم آہنگ کر دیتے ہیں: ''قرآن مجید نے ہبوط آدم کا ذکر کیا تو یہ بیان کرنے کے لیے نہیں کہ کرۂ ارض میں انسان کا ظہور کس طرح ہوا، اس کے پیش نظر حیات انسانی کا وہ ابتدائی دور ہے جب اس پر جبلی خواہشات کا غلبہ تھا اور جس سے گزر کر اس نے رفتہ رفتہ محسوس کیا کہ وہ اپنی ذات میں آزاد ہے اور اس لیے شک اور نافرمانی دونوں کا اہل ہے۔ مختصراً یہ کہ ہبوط کا اشارہ کسی اخلاقی پستی کی طرف نہیں، اس کا اشارہ اس تغیر کی طرف ہے جو شعور کی صاف و سادہ حالت میں شعور ذات کی اولین جھلک سے اس نے اپنے اندر محسوس کیا، وہ

---

[۱۷] ڈاکٹر محمد رفیع الدین: پاکستان کا مستقبل، طبع دوم، آل پاکستان اسلامک ایجوکیشن کانگریس، لاہور، ۱۹۹۴ء، ص ۷، بحوالہ محمد شفیق عجمی: ص ۵۸۔

[۱۸] قرآن اور علم جدید، ص ۱۴۸، ۱۵۴۔

خواب فطرت سے بیدار ہوا اور سمجھا کہ اس کی حیثیت خود بھی اپنی جگہ پر ایک سبب کی ہے‘‘۔[19] عبد الماجد دریابادی نے ڈاکٹر محمد رفیع الدین کی رائے پر توقف کیا ہے، وہ کہتے ہیں ’’ایسے مقامات پر پہنچ کر طبیعت قدرۃً رکتی ہے، پھر بھی بہ حیثیت مجموعی جو کچھ بھی لکھا گیا ہے، مصنف کے صحیح دینی جذبے اور دینی استدلال دونوں کا آئینہ ہے‘‘۔[20]

۷ عبد الماجد دریابادی نے مصنف کا تعاقب کرتے ہوئے لکھا ہے کہ ’’کتاب کا کمزور ترین حصہ وہ ہے جو ماحولیات و معاشیات سے متعلق ہے اور جس میں حال کے بعض مالی و معاشیاتی نظریوں کو تمامتر اسلام کے مطابق دکھانے کی شد و مد سے کوشش کی گئی ہے‘‘۔(قرآن اور علم جدید، کے صفحات ۲۷ تا ۳۲، ۴۲، ۳۸۴۔۳۸۵) وغیرہ پر تو قرآن و حدیث دونوں کی کھینچ تان زبردستی کی حد تک پہنچ گئی ہے، اور اسی قبیل سے مصنف کے اس قسم کے ارشادات بھی ہیں کہ ’’غلامی کا وجود۔۔۔۔ توحید کے عقیدہ اور رب العباد کی بندگی کے ساتھ جمع نہیں ہوسکتا‘‘۔[21]

نصب العین کا تعین

ڈاکٹر محمد رفیع الدین نے اسلام میں داخلی طور پر بنیادی نصب العین کی تحقیق و جستجو کو اپنے غور و فکر کی بنیاد بنایا ہے۔ وہ ایک ایسے مقصود کو نصب العین کے طور پر اپنانے اور ساری کائنات کو اسی مقصود کے حصول کے لیے حرکت کے قائل ہیں۔ وہ اس بات کو انسان کی قوت محرکہ کے لیے ناگزیر سمجھتے ہیں کہ وہ ایک عظیم نصب العین کا سب سے پہلے تعین کرے۔ ڈاکٹر صاحب کے نزدیک وہ عظیم نصب العین توحید کے علاوہ اور کوئی نہیں ہوسکتا۔ نصب العین کے تعین کی ضرورت و اہمیت کے حوالے سے لکھتے ہیں:

> جب سے انسان کو اپنے آپ کا شعور حاصل ہوا ہے، انسان ایک ایسے نصب العین کی جستجو میں مصروف ہے جس کے سامنے وہ مستقل طور پر اور اپنے دل کی پوری رغبت کے ساتھ اپنی والہانہ محبت اور خدمت اور اعانت اور ستائش اور پرستش کے نذرانے پیش کرسکے۔ یعنی ایک ایسا

---

[19] اقبال: تشکیل جدید الہیات اسلامیہ، ص ۱۲۷، ۱۲۸، بحوالہ محمد شفیق عجمی: ص ۲۷۹۔

[20] قرآن اور علم جدید، مولانا ماجد کی نظر میں، ماہنامہ بیداری، لاہور، فروری ۲۰۰۸ء۔

[21] ماخذ سابق، ص ۳۸۶۔

نصب العین جو حسن اور کمال کے بلند ترین اور دائمی اور ابدی اوصاف سے آراستہ ہو، تاکہ اس کی محبت، انحطاط اور زوال اور مایوسی کے حادثات سے ہمیشہ ہمیشہ کے لیے محفوظ رہے۔[۲۲]

ڈاکٹر صاحب نصب العین کے حسن اور قبح کو پرکھنے کے لیے چند اصول متعین کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ اس کی وہ عمومی اور خصوصی صفات بیان کرتے ہیں۔ ان کے نزدیک نصب العین کی عمومی صفات دو ہیں: پہلی صفت جو ہر اس نقص یا عیب سے پاک ہو جس کا ہم انسان ہونے کی حیثیت سے تصور کر سکتے ہیں۔ دوسری صفت جس میں وہ تمام اوصاف بدرجہ کمال موجود ہوں جن کو ہم اپنی فطرت کے تقاضوں کی بنا پر عمدہ اور حسین اور قابل ستائش اور لائق محبت سمجھتے ہیں۔

اسی طرح ان کے نزدیک نصب العین کی خصوصی صفات آٹھ ہیں: (۱) نصب العین کا حسن غیر محدود اور لازوال ہو۔ (۲) انسان خود زندہ ہے، اس لیے اس کا نصب العین بھی زندہ و متحرک ہو۔ (۳) نصب العین اور اس کا حسن ہمیشگی کی مکمل ضمانت سے ہو۔ (۴) نصب العین ایسی قوت متحرکہ ہو، جو زندگی کے سارے احساسات سے مزین ہو ۔(۵) نصب العین صاحب قدرت و قوت ہو۔ (۶) نصب العین کے اندر نیکی کے سارے اوصاف پوری طرح موجود ہوں۔ (۷) نصب العین بے نظیر اور بے مثال ہو، اس کا ہمسر اور شریک نہ ہو۔ (۸) نصب العین کائنات کی تخلیق کے مدعا کے مطابق ہو۔[۲۳]

ڈاکٹر صاحب نصب العین کی تعریف، اس کی عمومی و خصوصی خصوصیات، اس کی ضرورت و اہمیت، غلط اور صحیح نصب العین کی بحث کے بعد اس عظیم نصب العین کا اعلان کرتے ہیں، یعنی عقیدۂ توحید، خدا کی وحدانیت و یکتائیت۔ وہ لکھتے ہیں: ''خالص اور کامل عقیدۂ توحید کے اندر تمام انسانوں کے لیے بے حد کشش اور جاذبیت ہے، اس کی وجہ یہ ہے کہ یہ عقیدہ کوئی خارجی چیز نہیں، بلکہ خدا کی محبت کے ایک مستقل اور طاقتور جذبہ کی صورت میں انسان کی فطرت کے اندر موجود ہے''۔[۲۴]

---

[۲۲] ڈاکٹر محمد رفیع الدین: منشور اسلام، ترجمہ: ڈاکٹر ابصار احمد، حکمت قرآن، قسط ۲، شمارہ مارچ ۱۹۸۷، ص ۴۱۔

[۲۳] ''منشور اسلام''، ترجمہ: ڈاکٹر ابصار احمد، حکمت قرآن، قسط ۲، شمارہ مارچ ۱۹۸۷ء، ص ۴۱۔ بحوالہ پروفیسر محمد عارف خان: ڈاکٹر محمد رفیع الدین مرحوم۔ شخصیت و فکر۔ ایک جائزہ، ص ۲۶۔

[۲۴] مظفر حسین (مدیر) اسلامی تعلیم، (رفیع الدین نمبر)، شمارہ ۶، جلد ۲، نومبر، دسمبر ۱۹۷۳ء، ص ۷۔ بحوالہ پروفیسر محمد عارف خان: ص ۲۷۔

اسلام کی تعبیر و تشریح کا مسئلہ

ہر دور کے تقاضوں کے مطابق اسلام کی تعبیر و تشریح کے امکان کا مسئلہ، اسلام میں اس کی اجازت کا مسئلہ اور اس کے حدودِ کار کا مسئلہ، حکما کے نزدیک انتہائی اہم اور حساس موضوع ہے، حکما کے نزدیک اس کا ٹھیک ٹھاک تعین نہ ہونے کی بناپر امتِ مسلمہ ایک طویل عرصے سے انتہائی بے بسی میں اپنی بقا کی جدوجہد کر رہی ہے۔ جدید سائنسی اور فلسفیانہ نظریات کے مقابلے میں امتِ مسلمہ شکست سے دوچار ہو چکی ہے۔ ڈاکٹر محمد رفیع الدین نے اس موضوع کا اسلامی نقطۂ نظر سے جائزہ لے کر نہ صرف اس پر سیر حاصل بحث کی ہے، بلکہ اسلام میں جدید سائنسی فلسفیانہ نظریات کا مقام متعین کرنے کی ایک زبردست کوشش کی ہے۔

نظریۂ ارتقا اور ڈاکٹر صاحب کا موقف

اسلام میں تعبیر و تشریح کا مسئلہ کائنات کے نظریۂ ارتقا سے منسلک ہے۔ اگر اسلام میں نظریۂ ارتقا درست ہے تو پھر بدلتے دور کے تقاضوں کے مطابق اس کی تعبیر و تشریح لازمی امر ہے۔ ڈاکٹر محمد رفیع الدین نے قرآن اور جدید حکما کے نظریات پر بحث کی ہے اور نظریۂ ارتقا کے حق میں پُرزور دلائل دیے ہیں۔ قرآنی نظریۂ ارتقا بیان کرنے سے قبل معروف مغربی مفکر چارلس ڈارون کا نظریۂ ارتقا، میکڈوگل کا نظریۂ جبریت، فرائڈ اور ایڈلر کا نظریۂ شعور، کارل مارکس کا نظریۂ اشتراکیت اور میکیاولی کا نظریۂ وطنیت بیان کیا ہے، اس کے علاوہ برگساں کے نظریۂ ارتقا پر بھی بحث کی ہے۔ ڈاکٹر صاحب کے نزدیک نظریۂ ارتقا درست ہے۔ انہوں نے ڈارون کے نظریۂ حقیقتِ ارتقا کو قرآن کے مطابق درست قرار دیا ہے، البتہ اس کے نظریۂ سببِ ارتقا کو خلافِ قرآن قرار دیا ہے۔[۲۵]

ڈاکٹر صاحب نظریۂ ارتقا کے تین مراحل بیان کرتے ہیں: (۱) "کائنات کی ابتدائی حالت سے لے کر اس حالت تک جب وہ اس قابل ہوئی کہ اس میں زندگی کا ظہور ہو سکے۔ (۲) پہلے زندہ حیوان کے ظہور سے لے کر نسلِ انسانی کے ظہور تک۔ (۳) انسان کے ظہور سے لے کر انسان کی نفسیاتی تکمیل تک۔ یہ مرحلہ اس وقت جاری ہے"۔ وہ قرآنی نظریۂ ارتقا بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ "حقیقتِ ارتقا

---

[۲۵] ڈاکٹر محمد رفیع الدین: قرآن اور علمِ جدید، ص ۱۳۷ تا ۱۴۰ اور اس سے آگے، آئیڈیالوجی آف دی فیوچر، دعوہ اکیڈمی، انٹرنیشنل اسلامک یونیورسٹی، اسلام آباد، نظرثانی شدہ ایڈیشن ۱۹۹۰ء، ص ۱۹۱، ص ۱۹۔

دنیا کے علمی مسلمات میں سے ہے اور قرآن اس کی مخالفت نہیں کرتا، بلکہ تائید کرتا ہے"[26]۔

اسلام کے قوانین کی تقسیم

مصنف کتاب اسلام کے قوانین واصولوں کو دو حصوں میں تقسیم کرتے ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ "ایک حصہ ابدی اور کلی قوانین پر مشتمل انسان کی عملی زندگی کی تشکیل پر حاوی ہے۔ یہ حصہ غیر متبدل قوانین پر مشتمل ہے۔ دوسرا حصہ اسلام کے معاشرے کے حالات کے مطابق ہمیشہ بدلتا رہتا ہے"۔[27] زندگی کے اس حصے میں تغیر ارتقاپذیر رہتا ہے، اس تغیر کا تقاضا ہے کہ اسلام کے اس ضمن میں اصول و قواعد کی تعبیر و تشریح ہوتی رہے، تاکہ زندگی کسی ایک مقام پر رک نہ جائے۔ ڈاکٹر صاحب کے نزدیک اللہ تعالی کا منشا یہ نہیں کہ زندگی ایک ہی مقام پر جدوجہد کرتی رہے، بلکہ اس کا منشا یہ ہے کہ زندگی جدوجہد کر کے بلند سطح پر قدم رکھے، پھر اس بلند سطح پر جم کر اگلی بلند سطح پر قدم رکھنے کی جدوجہد کرے[28]۔

نظریۂ ارتقا کے دلائل قرآن مجید سے

نظریۂ ارتقا کے لیے قرآن حکیم سے مصنف نے ۳۰ دلائل قائم کیے ہیں۔ ان میں سے چند یہ ہیں:[29]

۱۔ مقامِ ربوبیت نظریۂ ارتقا کی بنیاد ہے۔ "الحمد للہ رب العٰلمین" (سب تعریفیں اللہ تعالیٰ کے لیے ہیں جو اہلِ عالم کا رب ہے)۔ ڈاکٹر صاحب لکھتے ہیں کہ "ربوبیت کے معنی ہیں کسی چیز کو ادنی حالت سے ترقی دے کر اعلیٰ حالت تک پہنچانا۔ اور ارتقا کے معنی کیا ہیں؟ یہی کہ کوئی چیز ادنی حالت سے ترقی کر کے اعلیٰ حالت تک پہنچے"۔ گویا خدا کی ربوبیت کا نتیجہ ارتقا ہے۔ ارتقا کے ذریعے سے ہی خدا کی تمام صفات کا ظہور ہوتا ہے اور خدا کی کوئی صفت ایسی نہیں جو ارتقا کے مقاصد سے الگ ظہور پائے۔[30]

۲۔ انسان کی تخلیق میں بھی تدریج اور تربیت کے اوصاف ہوتے ہیں۔ "ھو الذي أنشأكم من الأرض" (اللہ وہ ذاتِ پاک ہے جس نے تمہاری نسل کو زمین سے پیدا کیا ہے)۔ زمین سے

---

[26] ماخذ سابق، ص ۱۴۶۔۱۴۸۔

[27] دیباچہ بعنوان تعارف، قرآن اور علم جدید، ص: ن۔ل۔

[28] پروفیسر محمد عارف خان: ڈاکٹر محمد رفیع الدین مرحوم۔ شخصیت و فکر۔ ایک جائزہ، ص ۱۹۔

[29] قرآن اور علم جدید، ص ۱۴۸۔۱۶۷۔

[30] ماخذ سابق، ص ۱۴۹۔

پیدائش کو ڈاکٹر صاحب نے نباتات کے رنگ میں قیاس کیا ہے اور اس کی تائید میں یہ آیت بیان کی ہے: "ما لکم لا ترجون للہ وقارا، وقد خلقکم أطوارا" (نوح: ۱۳۔۱۴)، "واللہ أنبتکم من الأرض نباتا" (نوح: ۱۷) (تمھیں کیا ہو گیا ہے کہ تم اللہ سے وقار کے آرزومند نہیں ہوتے اور یقیناً اس نے تمہیں مختلف مراحل سے گزار کر پیدا کیا ہے۔۔۔۔" اور اس نے تمہاری نسل کو زمین سے اگایا ہے جیسے کہ اور چیزیں زمین سے اگتی ہیں"۔ ان آیات کا مضمون نسلِ انسانی کے ارتقا کے تصور کے ساتھ مناسبت رکھتا ہے۔[31]

۳۔ تیسری دلیل کو ڈاکٹر صاحب نے یوں بیان کیا ہے: "نسلِ انسانی ہمارے سامنے موجود ہے، خدا تعالی کہتا ہے کہ ہم نے نسلِ انسانی کو نیست سے ہست کیا ہے اور ایک دن نسلِ انسانی نیست و نابود ہو جائے گی۔ اللہ تعالی کہتا ہے کہ ہم اسے دوبارہ زندہ کریں گے"۔ گویا یہ سارا عمل ان کے نزدیک ایک تدریج و ارتقا سے تعلق رکھتا ہے۔[32]

۴۔ کائنات کی تخلیق بھی یکایک نہیں ہوئی، ڈاکٹر صاحب نے اس ذیل میں یہ آیت بیان کی: "هو الذي خلق السموات والأرض وما بينهما في ستة أيام" (الحدید، ۴) (اللہ وہ پاک ذات ہے جس نے کائنات کو چھ دنوں میں پیدا کیا)۔[33]

۵۔ کائنات کی ارتقائی حالت کو بیان کیا ہے۔ کائنات دھوئیں کے ایک بادل سے آگے بڑھی اور چاند و سورج الگ ہوئے۔ زمین پر سمندروں کے پانی میں تمام انواع حیوانات کی زندگی کا آغاز ہوا۔ اس کی تائید میں وہ آیت قرآنی "أو لم ير الذين كفروا أن السموات والأرض كانتا رتقاً ففتقنهما وجعلنا من الماء كل شيء حي" (کیا ان لوگوں کو معلوم نہیں کہ زمین اور آسمان ملے ہوئے تھے اور ہم نے ان کو ایک دوسرے سے الگ کیا اور پانی سے ہر جاندار کو زندہ کیا) (الأنبیاء: ۳۰)۔[34]

۶۔ ڈاکٹر صاحب کا نقطۂ نظر یہ ہے کہ قرآن کے ارشاد کے مطابق زندگی کا آغاز سمندروں کے

---

[31] ماخذ سابق، ص ۱۵۴-۱۵۵۔

[32] ماخذ سابق، ص ۱۵۶۔

[33] ماخذ سابق، ص ۱۶۰۔

[34] ماخذ سابق، ص ۱۶۲-۱۶۳۔

ساحل پر کیچڑ میں ہوا اور اس کی تخلیق کئی مدارج سے گزری اور اس پر وقت صرف ہوا۔ ان کا کہنا ہے کہ قرآنی وضاحت کے مطابق مٹی یا کیچڑ سے تخلیق بشر کی ابتدا ہوئی ہے اور پھر اس کا جسم توالد اور تناسل کے ذریعے سے تدریجاً ترقی پا کر مکمل ہوا ہے۔[۳۵]

۷،۸۔ ڈاکٹر صاحب قرآن کی آیت "ولقد خلقنا الإنسان من سللة من طين" (المؤمنون: ۱۲) (بے شک ہم نے انسان کو مٹی کے خلاصے سے پیدا کیا) بیان کرتے ہوئے اسے ارتقا اور اس کی حیاتیاتی نشو و نما پر منطبق کرتے ہیں۔[۳۶]

۹۔ سورۃ النساء کی آیت نمبر ۱ سے تخلیقِ زوج کو ارتقا کے مرحلے سے منسلک کیا ہے، کیوں کہ بصورتِ دیگر خدا تعالیٰ حضرت آدم علیہ السلام کے ساتھ ہی حوا علیہا السلام کو پیدا کرنے پر قادر تھا۔[۳۷]

۱۰۔ "اِقرأ با سم ربک الذي خلق، خلق الإنسان من علق" (العلق: ۱۔۲) (اس خدا کے نام سے پڑھ، جس نے انسان کو ایک لو تھڑے سے پیدا کیا)۔ ڈاکٹر صاحب کے نزدیک جسم انسانی کے ارتقا کی یہ ایک ابتدائی حالت ہے، ان کے نزدیک اس آیت کے مضمون کا اطلاق جس طرح ایک فرد انسانی کی تخلیق پر ہوتا ہے، اسی طرح سے نسلِ انسانی کے ارتقا پر بھی ہوتا ہے۔[۳۸]

ڈاکٹر صاحب نے مادی اور حیاتیاتی مرحلوں میں کائنات کے ارتقا کو قرآن حکیم سے دس دلائل کے ذریعے حقیقتِ ارتقائے کائنات قرار دیا ہے۔ اس کے بعد قرآن سے اس نفسیاتی ارتقا کو ثابت کیا ہے۔ آیت قرآنی "اليوم أكملت لكم دينكم وأتممت عليكم نعمتي" (المائدۃ: ۳) (آج میں نے تمہارا دین تمہارے لیے مکمل کر دیا ہے اور اپنی نعمت تم پر پوری کر دی ہے) سے یہ ثابت کیا ہے کہ ہدایتِ الٰہی نے بھی ارتقائی منازل طے کی ہیں۔ انہوں نے پیغمبرانہ بعثت کو ارتقا کا حصہ قرار دیتے ہوئے پیغمبرانہ تعلیمات اور پیغام کو بھی ارتقا و تدریج کے اصولوں کے مطابق بیان کیا ہے۔[۳۹]

---

[۳۵] ماخذ سابق، ص ۱۶۴۔

[۳۶] ماخذ سابق، ص ۱۶۵۔-۱۶۶۔

[۳۷] ماخذ سابق، ص ۱۶۶-۱۶۷

[۳۸] ماخذ سابق، ص ۱۶۷

[۳۹] ماخذ سابق، ص ۱۶۹

مصنف پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کے پیغام نبوت کو چار ادوار کے تحت بیان کرتے ہیں: ''پہلا دور، جس میں ایمان لانے والوں کی تعداد ایک آدمی سے ارتقاپذیر ہو کر ایک مؤثر گروہ کی صورت اختیار کر گئی۔ دوسرا دور، جب پیغمبرانہ نظریات کے مقابلے میں دوسرے نظریات کا غلبہ ہونے لگا اور پیغمبرانہ نظریات کا حسن ماند پڑنے لگا۔ تیسرا دور، جب نئے گروہ کی شمولیت سے مخالف پیغمبرانہ نظریات پر غلبہ حاصل کیا۔ چوتھا دور، جس میں پیغمبرانہ نظریات نے دنیا کے مخالفانہ نظریات پر غلبہ حاصل کرنے کے بعد اخوت انسانی کی بنیاد پر اتحادِ انسانی کی بنیاد رکھی''۔[۴۰]

نفسیاتی ارتقا کو قرآن سے ثابت کرنے کے بعد ڈاکٹر صاحب نے مختلف اعتراضات، جو اسلامی حلقوں سے وارد ہوئے ہیں، کا جواب دیا ہے۔

چونکہ ارتقا کی منازل فکر وتدبر کی مرہونِ منت ہے، اس لیے یہ جاننا ضروری ہے کہ ڈاکٹر محمد رفیع الدین نے اسلام میں فکر و فلسفے سے متعلق کیا موقف اختیار کیا ہے۔ ڈاکٹر صاحب ان حکما و مفکرین میں شامل ہیں جو فکر وتدبر کے ہتھیاروں کو پوری طرح حرکت میں لانے کے قائل ہیں۔ ان کے نزدیک امت مسلمہ کی موجودہ زبوں حالی کا بنیادی سبب فکر وتدبر کے ہتھیاروں کا استعمال نہ کرنا ہے۔[۴۱]

---

[۴۰] ڈاکٹر محمد رفیع الدین: آئیڈیالوجی آف دی فیوچر (انگریزی) دعوہ اکیڈمی، انٹرنیشنل اسلامک یونیورسٹی، اسلام آباد، نظرثانی شدہ ایڈیشن ۱۹۹۰، ص ۳۷۳-۳۷۵۔

[۴۱] ارتقاء کے مسئلے پر ڈاکٹر محمد رفیع الدین کی رائے ان کا ایک نظریہ ہے جس سے اتفاق ضروری نہیں ہے اور نہ یہ دعوی کیا جاسکتا ہے کہ علامہ محمد اقبال کا بھی یہی نظریہ تھا۔ خود نظریۂ ارتقاء پر مغربی علماء کا پوری طرح اتفاق نہیں ہے۔ ڈارون کے ۱۸۵۹ میں نظریۂ ارتقاء کی تائید میں ''اصل انواع'' On the Origin of Species نامی کتاب شائع کرنے کے بعد سے یہ آج بھی محض ایک ''نظریہ'' ہے جس کے انکار یا تبدیلی کا عمل نت نئے علمی انکشافات کی روشنی میں عمل میں آتا رہے گا۔ یہ واضح ہے کہ اللہ پاک نے قرآن مجید میں بار بار کہا ہے کہ جب وہ کچھ پیدا کرنا چاہتے ہیں تو کہتے ہیں ''ہو جا اور وہ ہو جاتا ہے'' (کن فیکون: البقرۃ ۱۱۷، آل عمران ۴۷، ۵۹، النحل ۴۰، مریم ۳۵، یٰسین ۸۲)۔ اسی طرح اللہ پاک نے بار بار عدم سے کسی چیز کو پیدا کرنے (خلق) کو اپنی طرف منسوب کیا ہے (مثلاً المائدہ ۱۷، الصافات ۱۱، الحجر ۲۶، المؤمنون ۱۲ وغیرہ)۔ ایسی صورت میں یہ قبول کرنا مشکل ہے کہ کوئی ابتدائی مادہ از خود دھیرے دھیرے الگ الگ ارتقائی شکلیں اختیار کرتا رہا۔ البتہ ہم تسلیم کرتے ہیں کہ موسم اور علاقوں کے تغیر سے اشکال واجسام میں کچھ تبدیلیاں واقع ہوتی ہیں (مدیر)۔

یوگا درشن: ایک تحقیقی مطالعہ

ڈاکٹر محمد احمد نعیمی

اسسٹنٹ پروفیسر ڈپارٹمنٹ آف اسلامک اسٹڈیز، جامعہ ہمدرد، نئی دہلی

manaeemi@jamiahamdard.ac.in

ہندو دھرم میں درشن کی ضرورت و اہمیت: ہندو دھرم شاستروں کی روشنی میں تناسخ یا آواگمن (Theory of transmigration of soul) سے نجات (مکتی) کے تین راستے یا تین ذرائع بیان کیے گئے ہیں: (۱) کرم- عمل (۲) گیان- علم (۳) بھگتی- ریاضت۔

نجات (موکش یا مکتی) کا ایک راستہ راہِ علم یعنی گیان مارگ ہے۔ وہ دولت مند اور ذہین لوگ جن کے پاس مقدس تحریرات کی مختلف فلسفیانہ تفاسیر پڑھنے کا وقت تھا ان کے لیے راہِ علم نفع بخش تھی۔ عموماً جب لوگ راہِ علم کو ہندومت میں نجات (موکش یا مکتی) کے ذرائع کے طور پر لیتے ہیں تو ان کی مراد ہندو فلسفے کے مختلف نظامِ فکر ہوتے ہیں جو موکش یا مکتی کے لیے راستہ دکھاتے ہیں۔ اور یہ نظامِ فکر (۱) میمانسا (۲) ویدانت (۳) سانکھیہ، (۴) یوگ (۵) نیایہ اور (۶) ویشیشک ہیں۔

ان سب کی بنیاد ویدوں پر ہے۔ سب کا مقصد موکش یا مکتی ہے اور سب دوبارہ جنم اور وجودِ ازل پر یقین رکھتے ہیں۔ یعنی ہندو عقیدے کے مطابق نہ کوئی تخلیق آخری ہے نہ کوئی دنیا یعنی زمانۂ تربیت و تنظیم آخری ہے اور نہ کوئی قیامت آخری کیونکہ تخلیق، تربیت اور اختتام کا یہ سلسلہ ازلی اور ابدی ہے۔ اس طرح نہ کوئی تخلیق پہلی ہے نہ کوئی دنیا پہلی کہ جس سے پہلے کوئی دنیا نہ رہی ہو۔ اور نہ کوئی قیامت پہلی ہے کہ جس سے پہلے کوئی قیامت نہ ہوئی ہو۔ اس طرح مذکورہ بالا چھے درشن ہندوؤں کی نجات کا ذریعہ اور آواگمن کے چکرویو سے موکش یا مکتی (نجات) کا راستہ ہیں۔[1]

درشن (فلسفہ) کی تعریف: مناسب طریقے یا تدبیر و لیاقت کے ساتھ علم الحقائق حاصل کرنے کی کوشش کو درشن کہتے ہیں۔ یعنی انسان کیا ہے؟ اس کی زندگی کا مقصد کیا ہے؟ اور اس کی منزل کیا ہے؟

---

[1] لوئیس مور (Lewis Moore) (اردو ترجمہ: یاسر جواد)، مذاہب عالم کا انسائیکلوپیڈیا، نئی دہلی، البلاغ پبلیکیشنز، ۲۰۱۱، ص: ۱۹۰

یہ ساری کائنات کیا ہے؟ اس کا کوئی خالق بھی ہے یا نہیں؟ انسان کو کس طرح زندگی گزارنی چاہیے؟ ایسے بہت سے سوالات ہیں جنھیں بارہا مختلف ممالک کے انسان تہذیب کے شروع ہی سے سلجھانے کی کوشش کرتے آرہے ہیں۔ ہندوستانی درشن (فلسفے) کے مطابق ہمیں حقیقت کا مشاہدہ و نظارہ ہو سکتا ہے اور اسی کو درشن یا سمیک درشن کہتے ہیں۔ چنانچہ منو مہاراج بیان کرتے ہیں: ''سمیک درشن حاصل ہونے پر کَرم (Karma) انسان کو بندھن میں نہیں ڈال سکتے۔ جن کو یہ سمیک درشن حاصل نہیں ہے وہی سنسار کے جال میں پھنس جاتے ہیں۔''[۲]

بھارتیئے درشن (ہندوستانی فلسفہ) کا معنی و مفہوم: قدیم اور جدید، ہندو و غیر ہندو اور آستک و ناستک (Theist and Atheist) جتنی قسم کے ہندوستانی ہیں سبھی کے دارشنک وچاروں (فلسفیانہ خیالات و نظریات) کو بھارتیئے درشن کہتے ہیں۔ بعض لوگ بھارتیئے درشن کو ہندو درشن کا مترادف قرار دیتے ہیں۔ لیکن اگر ہندو لفظ کا معنی وید کا پیروکار ہو تو بھارتیئے درشن کا معنی صرف ہندوؤں کا درشن سمجھنا نامناسب ہوگا۔ اس سلسلے میں مادھوآچاریہ کو پیش کیا جاسکتا ہے۔ وہ خود وید کو ماننے والے ہندو تھے لیکن اس کے باوجود انھوں نے اپنے سرو درشن سنگریہ میں چارواک، بودھ اور جین متوں کو بھی درشن میں مقام دیا ہے حالانکہ ان تینوں متوں کے بانی ویدک دھرم کو ماننے والے ہندو نہیں تھے۔ پھر بھی ان متوں کو ہندوستانی درشن میں وہی مقام حاصل ہے جو ویدک ہندوؤں کے ذریعے جاری کردہ درشنوں کو ہے۔

بھارتیئے درشن کا نظریہ کافی وسیع ہے۔ اس کی مختلف شاخیں ہیں۔ ان میں اختلاف بھی ہے پھر بھی وہ ایک دوسرے کی ان دیکھی نہیں کرتی ہیں۔ سبھی شاخیں ایک دوسرے کے خیالات و نظریات کو سمجھنے کی کوشش کرتی ہیں۔ وہ خیالات و نظریات کی تدبیر و حکمت کے ساتھ معائنہ و تحقیق کرتی ہیں اور تبھی کسی اصول و مقصد تک پہنچتی ہیں۔ اسی نرم اور فراخ جذبے و ذہنیت کا نتیجہ ہے کہ بھارتیئے درشن میں صلاح، مشورے اور غور وخوض کے لیے ایک خاص طریقۂ کار کی ایجاد ہوئی۔ اس طریقۂ کار کے مطابق پہلے اندیشہ و دعویٰ ہوتا ہے۔ پھر تردید و انکار ہوتا ہے اور آخر میں جواب دہی، نتیجہ یا مقصد ہوتا ہے۔ پورو پکچھ (اندیشہ، الزام، دعویٰ) میں مخالف مت کی وضاحت ہوتی ہے اور اس کے بعد اس کی تردید یا مخالفت ہوتی ہے اور آخر میں اتر پکچھ (جواب دینا یا حل پیش کرنا) آتا ہے جس میں فلسفی اپنے اصول

---

[۲] منو اسمرتی، مترجم: پنڈت گرجا پرساد دویدی، ناشر: منشی نول کشور، لکھنؤ، ۱۹۱۷، ادھیائے ۶، اشلوک ۷۴

ومقاصد کی تکمیل وحمایت کرتا ہے۔

بھارتیئے درشن کی شاخیں: قدیم تقسیم وطبقہ بندی کے مطابق بھارتیئے درشن کو دو حصوں میں تقسیم کیا گیا ہے: (۱) آستک درشن اور (۲) ناستک درشن (Theist and Atheist) ۔

(۱) میمانسا (۲) ویدانت (۳) سانکھیہ (۴) یوگ (۵) نیائے اور (۶) ویشیشک آستک درشن کہے جاتے ہیں۔ ان کو شڈ درشن بھی کہا جاتا ہے۔

ان چھے آستک درشنوں کے علاوہ اور بھی کئی آستک درشن ہیں جیسے شیو درشن، پاڑنیئے درشن، رسیسور درشن (آیوروید) وغیرہ۔

ناستک درشن تین ہیں: (۱) چارواک درشن (۲) بودھ درشن اور (۳) جین درشن۔ یہ ناستک اس لیے کہے جاتے ہیں کہ یہ ویدوں کو نہیں مانتے ہیں۔

آستک اور ناستک درشن کا معنی و مفہوم: جدید ہندوستانی ادب میں آستک کا معنی ہے ''ایشور وادی'' یعنی خدا کو ماننے والا۔ اور ناستک کا معنی ہے ''غیر ایشور وادی'' یعنی خدا کو نہ ماننے والا۔ لیکن قدیم فلسفی ادب (دارشنک ساہتیہ) کے مطابق آستک کا مطلب ہے ''ویدوں کا پیروکار'' اور ناستک کا مفہوم ہے ''ویدوں کا منکر و مخالف''۔

بھارتیئے چھے (شڈ) آستک درشنوں میں سبھی ایشور کو نہیں مانتے ہیں۔ اس لیے آستک درشن کا معنی خداپرست (ایشور وادی) نہیں ہے بلکہ انھیں آستک اس لیے کہا جاتا ہے کہ یہ سبھی ویدوں کو مانتے ہیں۔ اور میمانسا و سانکھیہ حالانکہ ایشور کو نہیں مانتے ہیں لیکن پھر بھی وہ آستک کہے جاتے ہیں کیونکہ وہ وید کو مانتے ہیں۔ قدیم فلسفیانہ ادب کے مطابق ان دونوں لفظوں میں سے ہر ایک کا ایک دوسرا معنیٰ بھی ہے۔ اس دوسرے معنی کے مطابق آستک ''پرلوک'' (آخرت یا مرنے کے بعد کی دنیا) میں اعتقاد رکھنے والے کو کہتے ہیں اور ناستک ''پرلوک'' نہیں ماننے والے کو کہتے ہیں۔

مذکورہ بالا تقسیم کے مطابق میمانسا، ویدانت، سانکھیہ، یوگ، نیایہ اور ویشیشک کو آستک درشن اس لیے کہا گیا ہے کہ یہ ویدوں کو مانتے ہیں۔ لیکن اگر ان کی تقسیم پرلوک میں اعتقاد ویقین کی مناسبت سے کی جائے تو جین اور بودھ دھرم بھی آستک درشن کہے جائیں گے کیونکہ وہ دونوں پرلوک کو مانتے ہیں۔ شڈ درشن کو دونوں ہی معنی کی رو سے آستک کہہ سکتے ہیں یعنی وہ ویدوں کے پیروکار کی حیثیت سے بھی آستک ہیں اور پرلوک پر اعتقاد ویقین کی رو سے بھی۔ چارواک درشن دونوں میں سے کسی بھی معنی کے

لحاظ آستک نہیں ہے کیونکہ وہ وید اور پرلوک دونوں کا منکر ہے۔[۳]

بھارتیئے درشنوں کا تخلیقی سرچشمہ و ماخذ: مشہور و معروف آستک چھے درشنوں (Shad Darshan) میں میمانسا اور ویدانت تو ویدک تہذیب کی ہی دین ہیں۔ وید میں دو سلسلۂ خیالات (وِچار دھارا) تھے۔ ایک کا تعلق عمل (کرم) سے تھا اور دوسرے کا تعلق علم (گیان) سے تھا۔ یہ ترتیب وار ویدک کرم کانڈ اور ویدک گیان کانڈ کے نام سے ظاہر ہیں۔ میمانسا میں کرم کانڈ کا مناسب طریقے و تدبیر کے ساتھ بیان ہوا ہے اور ویدانت میں گیان کانڈ کا مکمل تجزیہ و تحقیق کی گئی ہے۔ میمانسا اور ویدانت میں ویدک خیالات کی میمانسا ہوئی ہے اس لیے دونوں کو کبھی کبھی میمانسا کہتے ہیں۔ ان دونوں میں فرق کرنے کے لیے میمانسا کو پورو میمانسا یا کرم میمانسا اور ویدانت کو اُتر میمانسا یا گیان میمانسا کہتے ہیں۔

علاوہ ازیں سانکھیہ، یوگ، نیایہ اور ویشیشک درشنوں کی تخلیق ویدک خیالات سے نہیں ہوئی ہے۔ ان کی تخلیق و ایجاد دنیوی خیالات سے ہوئی ہے۔ لیکن اس قول یا بات سے یہ نہیں سمجھنا چاہیے کہ یہ ویدوں کے مخالف و منکر تھے۔ بلکہ ان کے مقاصد و اصولوں میں اور ویدوں کے خیالات میں باہمی اختلاف نہیں تھا۔ ویدک تہذیب کے خلاف جو ردِّ عمل ہوئے تھے ان سے چار واک، بودھ اور جین درشنوں کی تخلیق و ایجاد ہوئی۔ یہ وید کا ثبوت نہیں مانتے تھے بلکہ یہ وید مخالف تھے۔[۴]

یوگا درشن (Yoga philosophy): یہ ہندوستانی فلسفے کی آستک (خدا پرست یا وید معتقد) شاخ اور ہندو مت کے ۶، عظیم راسخ الاعتقاد عقائد میں سے ایک اہم عقیدہ ہے، جو قدیم، وسط اور جدید ہندو متوں میں یوگ یا یوگا کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔ اس کی منظم تعلیمات و نظریے نے ہندوستان کے دیگر عقائد کے ماننے والوں کو ذہنی، جسمانی، روحانی اور فکری طور پر کافی متاثر کیا ہے۔

یوگا ہندو مت میں مراقبہ یا ریاضتِ باطنی اور ورزش کا ایک خاص طریقہ ہے جو انسان کو قوّتِ عرفان عطا کرتا ہے اور جس کا مقصد یہ ہے کہ عابد (یوگی) کی روح کائنات کی روح حقیقی سے متحد ہو جائے، یعنی آتما پرماتما سے مل جائے۔ یوگ کا لفظی معنی ہے جوڑنا، جو مختلف جسمانی صورتوں، دھیان یا مراقبہ، سانس لینے کے مخصوص طریقوں اور ورزشوں کو باہم جوڑتا ہے۔ یا اس کا معنی جسمانی حالت کا روحانی حالت

---

[۳] ڈاکٹر ستیش چندر اپادھیائے، ڈاکٹر دھیریندر موہن دت، بھارتیئے درشن An Introduction to Indian Philosophy، ہندی روپ کار: ہری موہن جھا اور نتیانند مشر، ہندی سنسکرن، پٹنہ، پستک بھنڈار، سن اشاعت درج نہیں، ص: ۱تا۳

[۴] بھارتیئے درشن، ص: ۳-۴۔

کے ساتھ اتصال ہے۔

اہل علم نے یوگا کے تین مادوں سے تین معانی بیان کئے ہیں: یجر یوگے اور تج سمادھو یعنی یجر بمعنی ملانا یا جوڑنا، تجُ مادہ بمعنی موقوفی ذہنی احوال یا یکسوئی اور تجُ سم یمنے، یعنی تج بمعنی قابو میں کرنا۔ مذکورہ تمام مختلف معانی میں غالب مفہوم "ملانا یا جوڑنا" ہے۔ ان کے عقیدے کے مطابق یوگ میں جو اعمال کرائے یا کیے جاتے ہیں اس سے انسان ایشور سے مل جاتا ہے۔ اور یہ تعلیم دیتا ہے کہ فرد کو جسمانی و نفسانی خواہشات ترک کرکے اور اپنے نفس پر قابو کرکے اپنی انفرادی روح کو خدا کے ساتھ باندھ لینا چاہیے۔ اگر ہم بات کریں یوگ کے اصطلاحی مفہوم کی تو ہندو علما نے اپنی تحریروں میں اس کے مختلف مفاہیم کی طرف اشارہ کیا ہے لیکن پتنجلی نے اپنے یوگ سوتر (۱۔۱) میں اس کا اصطلاحی مفہوم اس طرح بیان کیا ہے: "چت ورِتی نِرودھ"، یعنی قلبی و ذہنی احوال کی موقوفی۔[۵]

یوگ کا موجودہ فلسفہ رشی یاجناولکیہ کے ذریعے ترقی پایا۔ یقین کیا جاتا ہے کہ ان کا دور ۲۰۰ء قبل مسیح اور ۵۰۰ء عیسوی کے درمیان تھا۔ انہوں نے یوگ کی تعلیمات کو اپنے یوگ سوتر میں بیان کیا۔ یوگ کی بنیادی خصوصیت مراقبہ ہے جو دیوتاؤں کے لیے بھی ضروری ہے اگر وہ بار بار کے پیدا ہونے اور مرنے کے چکرویو سے نجات حاصل کرنا چاہتے ہوں۔

مہرشی پتنجلی یوگ درشن کے محرک و بانی ہیں۔ یوگ درشن کا خاص موضوع یوگ ابھیاس یعنی ریاضتِ باطنی اور ورزش ہے اور یوگ شاستر کے مطابق یوگ کے آٹھ اجزا پر عمل کرنا اس کا مقصد ہے۔ یوگ قلبی کیفیت یا دل کے بھٹکاؤ کے انسداد یا روکنے (چت ورتی) کو کہتے ہیں۔

قلبی و ذہنی حالت و کیفیت کی اقسام: یوگ شاستر کے مطابق قلب و ذہن کی کیفیت یا حالت کی پانچ اقسام ہیں، جو درج ذیل ہیں:

- پہلی حالت چھِپت (Kshipt- Distracted) ہے۔ اس میں قلب و ذہن کی کیفیت مضطرب ہوتی ہے۔ یعنی دل و دماغ میں جلدی جلدی خیالات بدلتے رہتے ہیں اور دل دنیوی اشیا کی وجہ سے بے قرار رہتا ہے۔
- دوسری حالت وِچھِپت (Vikshipt - Partially concentrated) ہے۔ یہ چھِپت کی

---

[۵] ایس۔ ین۔ داس گپتا، تاریخ ہندی فلسفہ (مترجم: رائے شیو موہن لعل) جامعہ عثمانیہ، حیدرآباد، ۱۹۴۵ء، ص: ۵۷۳-۵۷۴۔

بنسبت پر سکون و پر امن حالت ہے، لیکن بالکل پر سکون نہیں۔ یعنی اس میں دل و دماغ اکثر غیر مستقل رہتا ہے لیکن بیچ بیچ میں کچھ استقلال کی بھی کیفیت پیدا ہو جاتی ہے۔

- تیسری حالت موڑھ (Moodh - Dull state) ہے۔ اس میں قلب و ذہن کی حالت نیند کے مثل مغلوب رہتی ہے اور انسان کی فہم و بصیرت یا شعور بے کار رہتا ہے۔

مذکورہ بالا تینوں قلبی و ذہنی حالتوں میں ریاضتِ باطنی یا مراقبہ ممکن نہیں ہے کیونکہ یہ حالتیں عبادت و ریاضت یا مراقبے کی تکمیل کے لئے مناسب و موافق نہیں ہیں۔

- چوتھی حالت ایکا گر (Ekagra - One point focus) ہے۔ اس حالت میں دل و دماغ کسی مقصد یا نصب العین میں محو و مرکوز رہتا ہے۔ یہ دل و دماغ کی فطری حالت ہے۔ اس میں باہری اشیا، تاریکی اور پراگندگی وغیرہ کا اثر نہیں رہتا ہے۔
- پانچویں حالت نِرُودھ (Niruddh - Restrained/ Controlled) ہے۔ اس میں غور و فکر کا بھی خاتمہ ہو جاتا ہے۔ اس حالت میں یوگ کرنے والا سکھ دکھ سے بیزار ہو کر، یا اس کو ترک کر کے نِرُودھ حالت میں پہونچ جاتا ہے۔ آخر الذکر دونوں حالتیں یوگا یعنی مراقبہ یا ریاضتِ باطنی اور اس کی ورزش کے لئے معاون و موافق ہیں۔[۶]

یوگ کی اقسام: یوگ کی کئی اقسام ہیں۔ مثلاً: راج یوگ، کرم یوگ، بھکتی یوگ، گیان یوگ، ہٹھ یوگ، دھیان یوگ، منتر یوگ، تنتر یوگ اور لے یا کنڈلنی یوگ وغیرہ۔ لیکن خصوصاً یوگ کی چار اقسام ہیں: راج یوگ، کرم یوگ، بھکتی یوگ اور گیان یوگ۔

- راج یوگ: یہ سبھی یوگوں کا راجا کہلاتا ہے کیونکہ اس میں ہر ایک قسم کے یوگ کی کوئی نہ کوئی شئ ضرور پائی جاتی ہے۔ راج یوگ کا موضوع یا مقصد قلبی کیفیت یا ذہنی حالت کو قابو میں کرنا یا روکنا ہے۔ مہرشی پتنجلی نے پر سکون و منظم قلب و ذہن والوں کے لئے مشق اور ترک دنیا و علیٰحدگی پسند اور بے قرار دل و دماغ والوں کے لئے کریا یوگ (یہ ایک طرح کا قدیم یوگ ہے اس میں منظم انداز میں سانس لینے کے طریقے شامل ہیں) کا سہارا لے کر آگے بڑھنے کا طریقہ بتایا ہے۔ ان ذرائع کا استعمال کرنے سے مشاق یوگی کے رنج و غم کا خاتمہ ہوتا ہے، قلب و ذہن خوش ہو کر علم کی روشنی پھیلتی ہے اور نیکی و فہم و بصیرت کا حصول ہوتا

---

[۶] پاتنجل یوگ سوتر (ہندی میں نصاب کی کتاب)، اترا کھنڈ اوپن یونیورسٹی، سن اشاعت درج نہیں، ص: ۱۳ تا ۱۹

ہے۔ہر انسان میں بے شمار علم اور قوت کا جائے وقوع ہے۔راج یوگ انہیں بیدار کرنے کا راستہ ظاہر کرتا ہے اور انسان کے دل ودماغ کو یکسو کرکے اس کو سمادھی (اعلیٰ درجے کی خوشی) والی مکمل یکسوئی کی حالت میں پہونچا دیتا ہے۔ مختصر یہ کہ جس یوگ میں کسی ذہنی یا عملی تجویز کی سفارش کی گئی ہو یا انسان ایک خاص قسم کے عقلی یا ذہنی آثار سے خود کو گہرے طور پر متلازم کرلے تو وہ راج یوگ کہلاتا ہے۔[8]

خیال رہے کہ راج یوگ میں دھیان سب سے زیادہ اہم ہے اور یہ آٹھ اجزا پر مشتمل ہے جو اس طرح ہیں:

(۱) یم: حلف یا عہد وپیمان۔(۲) نیم: چال چلن یا ہدایت ونصیحت۔(۳) آسن: بیٹھنے کے مختلف انداز۔ (۴) پرانایام: ضبطِ تنفس۔(۵) پرتیاہار: حواس پر قابو پانا۔(۶) دھارنا: یکسوئی۔(۷) دھیان: مراقبہ۔ (۸) سمادھی: اعلیٰ درجے کی خوشی یا آخری نجات۔

- **کرم یوگ:** یعنی یوگی کا اپنے اعمال یا فرائض میں محو ہونا، دھرم پر عمل کرکے گناہوں کا خاتمہ کرنا اور اپنے عروج کی طرف قدم بڑھانا لیکن انعام یا جزا کی خواہش وامید نہ رکھنا کرم یوگ کہلاتا ہے۔ کرم یوگ تعلیم دیتا ہے کہ بھلائی یا خدمت کے لئے خدمت کرو اور بدلے میں کسی انعام کی توقع نہ رکھو، جیسے: بارش، ندی، درخت اور صوفی سنت بے غرض اور بے لوث جذبے کی علامت تسلیم کئے جاتے ہیں کیونکہ یہ سبھی کو یکساں فائدہ پہنچاتے ہیں۔

ہندو مذہبی فلاسفہ کے نزدیک کرم یوگ ہی وہ یوگ ہے جس کے ذریعے سے انسان اپنی روح سے متصل ہو پاتے ہیں۔ نیز کرم یوگ انسان کے روحانی علم کو بیدار کرتا ہے۔اس کے بعد انسان نہ صرف اپنی موجودہ زندگی کے مقاصد کو بلکہ اس زندگی کے بعد کی کامیابی وترقی کو پہلے سے حاصل کر سکتے ہیں۔اس یوگ میں اعمال وفرائض کے ذریعے ایشور (خدا) کا حصول کیا جاتا ہے۔اس لئے گیتا میں اس کو سب سے عظیم یوگ مانا گیا ہے۔[9] خلاصہ یہ کہ جب لفظ کرم یوگ کا استعمال کیا جاتا ہے تو اس کے صرف یہ معنی ہوتے ہیں کہ انسان خود کو فرائض کی انجام دہی کے لزوم سے متلازم کرلے۔[10]

- **بھکتی یوگ:** یہ یوگ کی مختلف قسموں میں سے ایک قسم ہے۔اس کو بہت اہم اور اعلیٰ مانا گیا

---

[8] تاریخ ہندی فلسفہ، ص: ۵۷۴

[9] سوامی نرنجنانند، کرم اور کرم یوگ، یوگ پبلی کیشنز، مونگیر، ۲۰۱۰، ص: ۱-۱۵، بھگوت گیتا، ادھیائے ۶/۱شلوک ۲

[10] تاریخ ہندی فلسفہ، ص: ۵۷۴

ہے۔ کیوں کہ یہ سب سے آسان و سہل ہے۔ چھوٹا بڑا، کوئی بھی اس کو بآسانی کر سکتا ہے، اس میں ذرا بھی کوئی شک وشبہ نہیں۔ بھکتی کے معنی ہیں: ''خدمت، بندگی وعبادت، محبت اور ایشور کے تئیں عقیدت، کائنات کے لئے محبت وفاداری، سبھی جاندار مخلوق کے لئے عزت اور ان کا تحفظ۔ ایشور کے ساتھ تعلق جوڑنے کی وجہ سے اس کو بھکتی یوگ کہا گیا ہے''۔

بھکتی یوگ کا راستہ یوگی کو اپنے مقصد کی طرف براہ راست اور بحفاظت پہنچا دیتا ہے۔ بھکتی یوگ میں ایشور کے کسی روپ کی بندگی بھی شامل ہے۔ نیز ایشور (خدا) کے حصول کے لئے یہ سب سے آسان اور فطری طریقہ ہے۔ اور اس کے مطابق ایشور سب جگہ ہے، ہمارے اندر اور چاروں طرف ہے۔ یہ ایسا ہے جیسے ہم ایشور سے ایک اعلیٰ دھاگے سے جڑے ہوں اور وہ ہے محبت کا دھاگہ۔ ایشور دنیا کی محبت ہے ،اور محبت اور خدائی مہربانی ہمارے چاروں طرف ہے اور ہمارے ذریعے سے بہتی ہے لیکن ہم اس تعلق سے بیدار نہیں ہیں۔

مختصر یہ کہ بھکتی یوگ سے مراد اپنے محبوب خدا میں محبت وعقیدت رکھ کر، کائنات میں ایشور کے جلوے دیکھ کر باطنی ترقی کرنا اور ایک مثبت طریقے سے جذبات وخواہشات کو قابو کرنا ہے۔ اور یہ ان تین راستوں میں سے ایک اہم راستہ ہے جس سے موکش یا مکتی (نجات) حاصل ہو سکتی ہے۔ بھجن کیرتن اور ستسنگ بھی اس کے ذرائع ہیں۔[۱۱]

- **گیان یوگ:** علم اور اپنے بارے میں معلومات حاصل کرنے یا علم کے ذریعے سب سے اعلیٰ درجے کی حالت وکیفیت کے حصول کے راستے کو گیان یوگ کہا جاتا ہے۔ یہ رشی یا اہل علم و دانش کا راستہ ہے۔ اس میں مذہبی کتب (گرنتھ) اور ان کے مطالعے کے ذریعے سے عقل وذہن کی ترقی ہوتی ہے۔ گیان یوگ کو سب سے مشکل مانا جاتا ہے اور ساتھ ہی ساتھ یہ سب سے آشکار ہوتا ہے۔ گیان (علم) کے ذریعے سے خدائی شکل وصورت کا علم اور حقیقی حق و صداقت کا علم گیان یوگ کا نصب العین ہے۔

گیان یوگ کا اگر تحقیقی تجزیہ کیا جائے تو حقیقت میں گیان یوگی مایاواد (ایشور کے علاوہ کائنات کی ساری اشیا کو فانی، فریب اور جھوٹ ماننے کا اصول) کے اصل عنصر سے آگاہ ہو کر اپنی حقیقت اور ویدوں کے خدائے واحد ولاثانی نظریے کے مطابق روح کی حقیقی شکل وصورت سے (ادویت مت) واقف ہو کر

---

[۱۱] یوگی آدتیئے ناتھ، راج یوگ سوروپ ایوم سادھنا، ص: ۳۸-۵۳

نجات (مُکتی) حاصل کرتا ہے۔"[۱۲]

یوگ کے اعضا یا اجزا : دھرم شاستروں کے مطابق یوگ کے آٹھ اجزا (Parts) ہیں، جن کی مختصر وضاحت حسب ذیل ہے:

(۱) یم(Yama): وہ حقوق جو بندوں سے متعلق ہیں یعنی حقوق العباد۔ اور وہ پانچ ہیں: (۱) اہنسا یعنی ظلم و ستم نہیں کرنا۔ (۲) ستیہ یعنی جھوٹ نہیں بولنا۔ (۳) اَستیہ یعنی چوری نہیں کرنا۔ (۴) برہمچریہ یعنی پاکدامن رہنا، نفس کشی کرنا یا جسمانی ہوس اور نفسانی خواہشات سے پرہیز کرنا۔ (۵) اَپریٔ گرہ یعنی لالچ و طمع نہیں کرنا اور ایثار کی عادت ڈالنا۔ یعنی یَم میں انسان کو نیکی و پرہیزگاری کے کچھ عہد و پیمان کرنا پڑتے ہیں۔ اور یہ عہد و پیمان زندہ مخلوقات کو نقصان پہنچانے اور ناپاکی کے خلاف ہیں"[۱۳]۔

(۲) نیم(Niyama): نیم سے مراد ایشور کے حقوق ہیں اور وہ حسب ذیل ہیں: (۱) شوچ: اس کا مطلب ہے ظاہری و باطنی دونوں لحاظ سے طہارت و پاکیزگی حاصل کرنا۔ (۲) سنتوش: یعنی صبر و توکل کرنا۔ جو پاس ہو، جتنا ہو اس پر صبر کرنا اور اسی میں مطمئن اور راضی رہنا۔ (۳) تپ یعنی عبادت و ریاضت کرنا۔ (۴) سوادھیائے یعنی بذات خود دھرم گرنتھوں کا مطالعہ کرنا۔ (۵) ایشور پرِڑی دھان یعنی خدا کی محبت کا جذبہ بیدار کرنا اور ایسا کوئی کام نہ کرنا جس سے ایشور ناراض ہو۔ ان اخلاق و آداب کی مشق کرنا اور ان کا خوگر ہونا نَیم کہلاتا ہے اور اس میں انسان اندرونی قناعت، سکون اور طمانیت حاصل کرنے کی کوشش کرتا ہے۔

(۳) آسن(Asana) : یہ یوگ کا تیسرا جز ہے۔ اس کا مطلب ہے ایسے جسمانی عمل یا ورزش کرنا کہ جس سے انسان سست و بیمار نہ ہوں یعنی خوشی و شادمانی سے معمور جسمانی حالت کو آسن کہتے ہیں۔ اور اس میں انسان مخصوص آسن (بیٹھنے کے مختلف انداز) سیکھتا اور ان پر عمل کرتا ہے۔

(۴) پرنایام(Pranayama): ناک کے ایک سوراخ سے سانس لے کر کچھ دیر سانس روک کر دوسرے سے نکالنا۔ یعنی نظم و ضبط کے ساتھ سانس لینے اور چھوڑنے کو پرانایام کہتے ہیں۔ اس سے برے خیالات اور وسوسے نہیں آتے۔ گویا کہ اس میں انسان تنفس کی مشق کرتا ہے۔

(۵) پرتیاہار (Pratyahara): کھانے پینے میں توازن رکھنا، نہ بہت زیادہ کھانا نہ بہت کم، اسی طرح جو

---

[۱۲] سوامی وویکانند، گیان یوگ، شری رام کرشن آشرم، ناگپور، ۱۹۵۰ء ص: ۴۰-۴۸

[۱۳] یہ حقوق انسانی اسلام کے اندر بھی موجود ہیں اور جن کی اسلام میں بطور خاص نصیحت و تاکید فرمائی گئی ہے۔

کھانا ہو وہ عمدہ و صاف ستھرا کھانا ہو، حواس کو دنیاوی اور مادی چیزوں سے دور رکھنا پرتیاہار ہے۔ یعنی اس میں حسیات پر قابو پایا جاتا ہے اور انسان بیرونی دنیا سے کنارہ کشی اختیار کرتا ہے۔

(۶) دھارنا(Dharana): ایشور (خدا) کو اپنے اندر سمانا، اپنے دل کو اس کی محبت سے معمور کرنا یا دل و دماغ کو جسم کے اندر یا باہر کی کسی چیز پر مرکوز کرنا دھارنا کہلاتا ہے۔ گویا کہ اس میں یوگی ایک ہی شئے پر انتہائی توجہ قائم رکھتا ہے۔

(۷) دھیان(Dhyana): یعنی پہلے خدا کو دل میں بسا کر پھر اس کا دھیان کرنا، اس کی یاد کے جلوؤں میں محو و مستغرق ہونا۔ یعنی کسی شئ کے بارے میں نہایت مستحکم اور مسلسل غور و خوض یا مراقبہ دھیان کہلاتا ہے۔ اور اس میں انسان مراقبے کی کیفیت کو پانے کی کوشش کرتا ہے۔

(۸) سمادھی(Samadhi): یہ قلب و ذہن کی وہ حالت ہے کہ جس میں غور و خوض سے معمور دل اصلی مقصد اور دلی منشا کے حصول میں محو ہو جاتا ہے۔ یہ تین طرح کی ہوتی ہے: (۱) اس کی محبت و یاد میں گم و مستغرق ہو جانا۔ (۲) قربِ خدا کی طلب و جستجو ہر حال میں بنائے رکھنا۔ (۳) اس کی محبت میں خود کو فنا کر دینا۔ یعنی انسان کا اپنی ہستی فنا کر کے پورے طور سے خدا میں سما جانا۔ یعنی آخر کار اس میں یوگی سمادھی کی تلاش کرتا ہے اور وہ ایشور کے ساتھ متحد ہو جاتا ہے۔ جو لوگ ان مراحل کو طے کرتے ہیں وہ اعلیٰ جسمانی قوتیں اور ارتکازِ فکر کی نمایاں صلاحیتیں حاصل کر لیتے ہیں۔[14]

مذکورہ بالا آٹھ اجزا کی روشنی میں قدیم ہندوستانی فلسفے کے ماہرین یوگ کی تربیت کو دو منزلوں میں تقسیم کرتے ہیں۔ پہلی قسم (اسٹانگ یوگ) میں آسن، پرانایام اور پرتیاہار یعنی علی الترتیب طرزِ نشست، ضبطِ دم اور حواس سے ان کی محسوسات کی علیحدگی کو منتخب کیا گیا ہے۔ اس کا جسمانی پہلو ''من'' کو قابو میں کرنا ہے۔ اور دوسری قسم میں دھارنا، دھیان، اور سمادھی داخل ہیں جو مراقبہ کی مختلف صورتیں ہیں۔

یوگ میں درجہ کمال تک پہنچنے کے لئے ہندو مذہبی فلاسفہ نے دو صورتیں بیان کی ہیں۔ ایک بلند تر اور دوسری کمتر صورت ہے جن کو بالترتیب ''سمپرگیات سمادھی (Samparagyat Samadhi) اور اسمپرگیات سمادھی(Asamparagyat Samadhi)۔'' کہتے ہیں۔ دوسری صورت منزلِ مقصود ہے اور پہلی صورت اس کے وسیلے کے طور پر استعمال کی جاتی ہے۔

---

[14] شیو موہن لعل ماتھر، ہندی فلسفے کے عام اصول، ترقی اردو بیورو، نئی دہلی، ۲۰۰۰ء، ص ۲۲۶، بھارتیئے درشن، ص: ۲۷ تا ۲۸، مذاہبِ عالم کا انسائیکلوپیڈیا، ص: ۱۷۸

- سَمپَرگیات سمادھی (Samparagyat Samadhi): اس صورت میں عقل وذہن کا کام جاری رہتا ہے اگرچہ اس میں یوگی تمام چیزوں کو خارج کرکے کلیتاً کسی ایک خاص چیز کے دھیان میں منہمک ہو جاتا ہے۔اس کو یہ بھی خیال نہیں ہوتا کہ اس کو اس کے درشن ہو رہے ہیں۔اس لئے اس کو شعوری سمادھی کہا جاتا ہے۔یعنی عقل وذہن اپنے اصلی مقصد ودلی منشا میں مکمل طور سے محو ہو جاتا ہے اور اس کو اس بارے میں مکمل اور واضح علم ہوتا ہے۔یعنی ترکِ دنیا کے ذریعے یوگی دنیوی چیزوں کے بارے میں عیوب نکال کر ان سے خود کو علیحدہ کرلیتا ہے اور دل ودماغ سے اس کی خواہش تج دیتا ہے، جس کے سبب دل ودماغ یکسو ہو جاتا ہے اور ریاضتِ باطنی یا مراقبے کو قبول کرلیتا ہے۔
- اَسَمپَرگیات سمادھی (Asamparagyat Samadhi): اس صورت میں شئی کا شعور بھی ختم ہو جاتا ہے اس لئے اس مرحلے کو فوق الشعوری کہا جاتا ہے۔بدھی (عقل یا ذہن) اس وقت اپنا کام کرنا موقوف کر دیتی ہے۔یعنی اس صورت میں یوگی کو کچھ علم یا قیاس نہیں رہتا ہے۔ دل ودماغ جس کا دھیان (مراقبہ) کر رہا ہوتا ہے اسی میں اس کا دل دماغ مستغرق رہتا ہے۔ اس کے علاوہ کسی دوسری طرف اس کا دھیان نہیں جاتا۔دراصل یہ پرامن وپرسکون حالت ہے۔مختصر یہ کہ دونوں میں یکساں بلند ترین دھیان کی قوت کی ضرورت ہے۔[۱۵]

یوگ کے مطابق قلب وذہن کی یکسوئی اور خودشناسی کے لئے ایشور (خدا) ہی دھیان کا سب سے اعلیٰ موضوع ومحور ہے۔ایشور کامل، ہمہ گیر، دائمی، عالمِ کل اور تمام عیوب ونقائص سے منزہ ومبرّا ہے۔ یوگ کے مطابق ایشور کے وجود کے لئے درج ذیل ثبوت دیے جاتے ہیں: جہاں کمی بیشی ہے وہاں سب سے اعلیٰ کا ہونا انتہائی ضروری ہے۔ علم میں کمی بیشی ہے اس لئے کامل علم اور عالمِ کل کا ہونا یقینی ہے۔اور جو کامل عالم یا عالمِ کل ہے وہی ایشور ہے۔ مختصر یہ کہ یوگ روحانی، جسمانی، اور ذہنی وقلبی رسم ورواج یا اصول وقواعد کا ایک مجموعہ ہے جس کی تخلیق قدیم ہندوستان میں ہوئی۔

---

[۱۵] شیو موہن لعل ماتھر، ہندی فلسفے کے عام اصول، ص: ۲۲۷-۲۲۸

آزادیٔ ہند میں بنگالی مسلم خواتین کی خدمات

محمد لعل چاند شیخ

ریسرچ اسکالر شعبہ اسلامک اسٹڈیز، جامعہ ملیہ اسلامیہ

mdlalchand.jmi@gmail.com

جدید یورپ میں صنعتی انقلاب نے پیداواری عمل کو بہت تیز کر دیا تھا۔ مقامی ضرورت سے زیادہ پیداوار نے صنعت کاروں کو نئے بازاروں کی تلاش پر مجبور کیا۔ اسی طرح پیداوار میں اضافے کے لیے مزید خام مال کے ساتھ ساتھ اضافی مزدوروں کی بھی ضرورت پیدا ہوئی۔ نتیجے میں صنعت کاروں اور حکومتوں پر مشتمل نیا یورپی سامراج وجود میں آیا۔ مشرقی ممالک کی طرف جہاں قدرتی وسائل اور افرادی قوت دونوں کی فراوانی تھی، وہیں مغربی یورپی کمپنیوں نے اپنی حکومتوں کے زیر سایہ قدم رکھے اور آگے چل کر ان ممالک پر قبضے میں معاون و مددگار ہوئیں۔ بر صغیر ہندوستان میں ایسٹ انڈیا کمپنی بظاہر آئی تو تجارت کے مقاصد سے تھی لیکن فی الحقیقت اس کی نظر اس ملک کے قدرتی اور انسانی وسائل پر تھی۔ یہی وجہ ہے کہ کمپنی نے اس ملک کو کمزور کرنے والے تمام حربے اپنائے اور خود کو اتنا مضبوط اور بااختیار کر لیا کہ مقامی حکومتیں اس کے آگے بے بس ہو کر رہ گئیں۔

ہندوستان میں ایسٹ انڈیا کمپنی کی حکومت کی ابتدا اس وقت ہوئی، جب انگریزوں نے مقامی حکومتوں کو ٹیکس ادا کرنا بند کر دیا، ان کے خلاف جنگ چھیڑ دی اور ان کو اقتدار سے بے دخل کرنے لگے۔ انھوں نے یہاں کے کسانوں کی آزادی چھین کر ان سے اپنی من مانی کاشت کرانا شروع کر دیا۔ اسی طرح علوم و فنون اور تہذیب و تمدن کو اپنے رنگ میں رنگنا چاہا، ہندوستانی تاریخ و تہذیب کو ایک نئے رنگ میں پیش کیا۔ انگریزوں کے اس ہند مخالف اور جابرانہ رویے کے خلاف ہندوستانیوں کے تقریباً سبھی طبقات نے جد وجہد کی اور ان کی حکومت کے خاتمے میں اپنا رول ادا کیا۔ چوں کہ انگریزوں کی حکومت کا آغاز بنگال کے علاقے سے ہوا تھا اس لیے فطری طور پر انگریز حکومت سے آزادی کی جد وجہد میں بھی بنگال کا رول قائدانہ رہا۔ آزادی کی جد وجہد میں یہاں کے ہندو مسلمان، مرد و خواتین سبھی نے حصہ لیا۔

یہ امر بڑا دلچسپ ہے کہ انگریزوں سے آزادی کی جد وجہد پر بہت کام ہوا ہے۔ ملک کے مختلف

حصوں میں سماج کے مختلف طبقات سے تعلق رکھنے والے افراد اور گروہوں کی خدمات کا اعتراف بھی کیا گیا ہے۔ خود بنگال کی سطح پر بھی ایسا بہت سارا کام ہوا ہے جس میں سماج کے مختلف طبقات کی جدوجہد آزادی میں خدمات سے بحث کی گئی ہے البتہ بنگال کی مسلم خواتین کے حوالے سے کوئی ایسا باضابطہ قابل ذکر کام نہیں ملتا جس میں جدوجہد آزادی میں بنگالی مسلم خواتین کے کردار کا احاطہ کیا گیا ہو۔ ''بنگلہ جنگ آزادی میں بنگالی خواتین'' کے مصنف کملا داس گپت نے صرف ایک مسلم خاتون دولت النساء کا کسی قدر تفصیل سے ذکر کیا ہے بقیہ چند مسلم خواتین کے صرف نام یا ان کے بارے میں ایک دو جملے لکھنے پر اکتفا کیا ہے۔[1] اسی طرح انور حسین نے اپنی کتاب میں بنگالی خواتین سے زیادہ دیگر صوبوں کی خواتین کا ذکر کیا ہے۔[2] ''برطانیہ مخالف تحریک میں بنگالی خواتین'' کے مصنفین نے بھی اپنے مضمون میں صرف پانچ بنگالی مسلم خواتین کا ذکر ایک دو جملوں میں کیا ہے۔[3] صاعقہ حسین نے اپنی تحقیق میں کئی مسلم خواتین کے صرف نام ہی بیان کیے ہیں۔[4] کرشنا چندرا گھوس نے بھی اپنے مضمون ''ہندوستان کی تحریک آزادی میں مسلم خواتین کا کردار'' میں بنگالی مسلم خواتین کے بجائے زیادہ تر شمالی ہند کی خواتین کا ہی ذکر کیا ہے۔[5] ایسا ہی حال دیگر مصنفین و مضمون نگاروں کا بھی ہے۔ لہذا ضرورت اس بات کی متقاضی ہوئی کہ آزادی کی تحریک میں شامل بنگالی مسلم خواتین کی خدمات کی کھوج کی جائے۔ یہ مضمون اس سلسلے کی پہلی کڑی ہے۔

---

[1] گپت، کملا داس، سدھینتا سنگرامے بنگلر ناری (بنگلہ، جنگ آزادی میں بنگالی خواتین)، بسودھرا پرکاشنی، کلکتہ، ۱۹۵۲ء۔

[2] Anwar Hossain, *Muslim Women's Struggle in Colonial Bengal* (1873-1940), Progressive Publishers, Kolkata, 2003.

[3] Tanna Khatun, Md Sozib Hosen, Dr. Md. Rajaul Karim, "*Bengal Women in Anti-British Movement (1857-1947): A Historical Analysis*," *International Journal of Social Science and Education Research Studies,* Vol:02, Issue:10, Oct 2022.

[4] Hossain, Dr. Saika, "The Bengali Muslim Women's Struggle for Freedom(1905-1930)," *International Journal of Humanities and Social Science Invention,* V:27, Issue:11, November 2022.

[5] Mukhapadhyay, Apurva, *Women, Society and Politics: A Study of South Asia,* Avenel Press,2018. مضمون نگار کرشنا چندرا گھوس، بھاروتیر سادھی نوتا سنگرامے مسلم ناریدیر وبودان (ہندوستان کی تحریک آزادی میں مسلم خواتین کا کردار)۔

ایسے تاریخی شواہد موجود ہیں کہ جنگ آزادی کی ابتدا خواہ حکومتی سطح[۶] پر ہوئی یا انفرادی[۷] سطح پر اس کی جڑیں بنگال کی سرزمین میں موجود تھیں۔ چنانچہ انگریزوں کے خلاف متحدہ بنگال میں جن تحریکوں نے سب سے پہلے منظم طور پر علم بغاوت بلند کیا، ان میں تیتومیر (۱۸۳۱-۱۷۸۲) کی ''تحریک طریقۂ محمدیہ''[۸] اور حاجی شریعت اللہ (۱۸۴۰-۱۷۸۱) کی ''فرائضی تحریک'' خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔

قابل غور بات یہ ہے کہ انگریزوں کے خلاف آزادی کے لیے چلنے والی ان سبھی تحریکوں میں مردوں کے شانہ بہ شانہ عورتوں نے بھی حصہ لیا۔ مثال کے طور پر اول الذکر یعنی تیتومیر کی والدہ عائشہ بیگم[۹] بذات خود ان کی تحریک میں شامل تھیں۔ ان کے بارے میں ہے کہ پڑھی لکھی خواتین کو وہ تحریک طریقہ محمدیہ میں حصہ لینے کے لئے ابھارتی تھیں اور غریب گھرانے کی خواتین کو انگریزوں کی مخالفت میں فارسی پڑھایا کرتی تھیں۔ گویا وہ خود تعلیم یافتہ اور حوصلہ مند خاتون تھیں، جو بلاخوف

---

[۶] سراج الدولہ پہلا ہندوستانی حکمراں تھا جس نے انگریزوں کے خلاف ۱۷۵۶ء میں جنگ لڑی اور کامیاب ہوا۔ (Ali, Muhammad Mohar, *History of the Muslims of Bengal*, Imam Muhammad Ibn Saud Islamic University, Riyadh, 1985, V:I A, P:664.)

[۷] فقیر نیتا مجنوں شاہ نے اٹھارہویں صدی عیسوی کی آخری دہائیوں میں انگریزوں کے ناک میں دم کر رکھا تھا۔ انہی کے سپاہیوں نے بعد میں تیتومیر اور حاجی شریعت اللہ کی تحریکوں کو آگے بڑھایا تھا (دیکھئے: مضمون نگار کی تحریر ''تیتومیر کی مذہبی اور سیاسی خدمات''، معارف، دار المصنفین، اعظم گڑھ، اپریل ۲۰۲۳، ص: ۶۳-۶۴)۔

[۸] تیتومیر نے دیگر ہندوستانی مصلحین کے مانند مسلمانوں کو قرآن وسنت کے مطابق زندگی بسر کرنے کی دعوت دی اور اپنے مقصد کے حصول کے لئے ایک تحریک کی بنیاد رکھی جسے ''طریقہ محمدیہ'' کے نام سے جانا جاتا ہے۔ یہ تحریک عوام و خواص کو خالص قرآن وسنت کی جانب دعوت دینے والی تحریک تھی جو اپنے قیام کے تقریباً دوسرے ہی سال سیاسی مسائل کو بھی سلجھانے لگی تھی۔ بعض دفعہ اسے محمد ابن عبدالوھاب کی ''وہابی تحریک'' یا شاہ اسماعیل شہید کی تحریک ''طریقۂ محمدیہ'' کا ہی حصہ سمجھ لیا جاتا ہے جو کہ صحیح نہیں ہے (ماخذ سابق، تیتومیر کی مذہبی اور سیاسی خدمات، ص: ۵۷-۵۸۔ قیام الدین احمد، ڈاکٹر ایس۔ بی۔ چودھری کے حوالے سے لکھتے ہیں کہ اکثر ان تمام مسلمانوں کو ''وہابی'' کہا جاتا تھا جو انگریزوں کے خلاف مہم جوئی کرتے تھے۔ (Ahmad, Qeyamuddin, *The Wahabi Movement in India*, Firma K. L. Mukhopadhyay, Calcutta, 1966, pp.:95, 98.)

[۹] بعض کتابوں میں ان کی والدہ کا نام عابدہ رقیہ خاتون بیان کیا گیا ہے۔ (Khan, Muhammad Mojlum, *The Muslim Heritage of Bengal*, Cube Publishing, England, 2013, p: 89.) اس زمانے میں ہندوستانی معاشرے میں تعدد ازدواج کا پایا جانا ایک عام اور برہمنوں میں قابل فخر بات تھی، لہذا ممکن ہے کہ ان کی کئی ماوؤں میں عائشہ بیگم بھی رہی ہوں۔ (Kaur, Manmohan, *Role of Women in the Freedom Movement* (1857-1947), Sterling Publishers, Delhi, 1960, pp.:21-22.)

برطانوی حکومت کے خلاف آواز بلند کرتی تھیں۔ اسی طرح جب حاجی شریعت اللہ کو عمر قید کی سزا سنائی گئی تھی تو ان کی والدہ[۱۰] نے کہا تھا کہ ''میرا بیٹا انصاف کے لیے لڑا، مجھے اس پر فخر ہے''۔ جب حاجی شریعت اللہ کا انتقال ہوا تو ان کی والدہ نے نوجوان لڑکیوں پر مشتمل ایک جماعت بنائی۔ اس جماعت نے فرائضی تحریک کے مجاہدوں کو انگریزوں کی نظروں سے چھپایا، زخمی سپاہیوں کی دیکھ ریکھ اور ان کی مرہم پٹی کی، برطانوی اسلحہ خانوں کا سراغ لگا کر ہتھیار جمع کیے، اور برطانوی حکومت کے خلاف بغاوت میں باقاعدہ شرکت کی۔ وثوق کے ساتھ یہ بات کہی جاسکتی ہے کہ حاجی شریعت اللہ کی والدہ ایک انقلابی رہنما تھیں۔ اسی طرح ۱۸۵۹ء میں جب ''نیل بغاوت'' ہوئی تو اس میں اس تحریک کے روح رواں عنایت خاں اور ولایت خاں[۱۱] کے خاندان کی تمام عورتیں شامل تھیں۔[۱۲]

متحدہ بنگال میں بنگالی خواتین اور خصوصاً مسلم خواتین میں آزادی کی لڑائی لڑنے کی جوت جگانے میں، اگر کسی پہلی غیر بنگالی خاتون نے نمایاں کردار ادا کیا، تو وہ بی اماں ہیں۔ جنگ آزادی کی مجاہدہ مولانا شوکت علی اور مولانا محمد علی کی والدہ (ام الاحرار) اپنے مذکورہ دونوں مجاہد بیٹوں کی رہائی کے ریزولیوشن کے تحت ۲۵ دسمبر ۱۹۱۷ء کو کلکتہ پہنچی تھیں۔[۱۳] انھوں نے کلکتہ میں کانگریس کے منعقد ہونے والے دوسرے اجلاس ۲۸ دسمبر ۱۹۱۷ء میں زبردست تقریر کی۔ ساتھ ہی بی اماں کا ایک پیغام مسلم لیگ کے تحت ۳۰ دسمبر ۱۹۱۷ء کو کلکتہ ہی میں منعقد ہونے والی ایک انجمن میں قاضی عبدالغفار نے پڑھا۔ ان دونوں تقریروں میں انھوں نے اپنے بیٹوں کی رہائی سے زیادہ ملک کی آزادی، انگریزوں کے ظلم و ستم کے

---

[۱۰] بعض مورخین کا ماننا ہے کہ والدہ کا انتقال حاجی شریعت اللہ کی والدہ کا انتقال ان کے بچپن میں ہی ہو گیا تھا۔ جبکہ بعض اس کے برعکس رائے رکھتے ہیں۔ (Khan, Dr.Muin-ud-Din Ahmad, *History of the Fara'idi Movement*, Islamic Foundation Bangladesh, 1984, p.:142.)

[۱۱] ان دونوں بھائیوں نے کئی شادیاں کی، جن میں زیادہ تر بیوہ تھیں۔ ولایت علی کی بیویوں میں بی بی امیرن اور دوسری بیوی حیدرآباد کے مرزا وحید بیگ کی صاحب زادی اور الٰہی بخش کی بیوہ دختر تھیں۔ اسی طرح عنایت علی کی بیویوں میں مفسر قرآن سید محمد مسافر کی بیٹی آمنہ اور اکبر علی کی بیوہ شریفن بی بی تھیں، شریفن جیسور (موجودہ بنگلہ دیش) میں زیادہ رہتی تھیں۔ (*The Wahabi Movement in India*, pp.:99-100.)

[۱۲] Tanna Khatun, Md Sozib Hosen, Dr. Md. Rajaul Karim, *Bengal Women in Anti-British Movement (1857-1947): A Historical Analysis*, p:553.

[۱۳] برنی، ضیاءالدین احمد، حیات مولانا محمد علی جوہر، اردو اکادمی سندھ، کراچی، ۲۰۰۱، ص: ۲۵۲-۲۵۳۔

خلاف کمربستہ ہونے اور دین و وطن سے محبت پر زور دیا۔[۱۴] بی اماں کا ایک خواب تھا جس کے لیے وہ زندگی کے آخری لمحے تک لڑتی رہیں۔ وہ کہا کرتی تھیں: ''میں نے لال قلعے سے اپنا جھنڈا اترتے دیکھا ہے۔ میری آرزو ہے کہ میں فرنگی جھنڈے کو بھی لال قلعے سے اترتا دیکھوں۔''[۱۵]

۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی، تحریک خلافت، تحریک عدم تعاون، تحریک ترک موالات اور بھارت چھوڑو وغیرہ جیسی تحریکوں میں عورتوں نے مردوں کے دوش بدوش حصہ لیا اور طرح طرح کے مظالم برداشت کئے، حتیٰ کہ بعض تحریکوں کی بنیاد خود خواتین نے ہی رکھی۔ ہندوستانی خواتین کی بہادری و دلیری کو دیکھتے ہوئے کرنل ہڈسن نے ایک موقع پر کہا تھا: ''جس ملک کی خواتین اتنی وفاشعار اور بہادر ہوں، اُس ملک پر انگریزوں کی فتح چند وطن فروش اور غداروں کی نمک حرامی پر ہی منحصر ہے۔''[۱۶] اس میں شبہ نہیں کہ ہندوستان کی جنگ آزادی کی جدوجہد کو کامیاب بنانے کے لیے اس ملک کی مسلم خواتین اور خاص طور پر بنگالی مسلم خواتین نے بیش بہا خدمات انجام دی ہیں۔ ان کی قربانیوں کو ہمیشہ یاد رکھا جائے گا۔ اس حوالے سے ہندوستانی تحریک آزادی کو اپنے خون پسینے سے سیراب کرنے والی بنگالی مسلم خواتین میں سے بعض کا تعارف ذیل میں پیش کیا جارہا ہے۔

پھول بہار بی بی: ان کی پیدائش ۱۹۱۶ء میں ہوئی تھی۔ ان کی شادی ڈھاکہ کے شہر وکرم پور (موجودہ منشی ضلع) کے سبھاس پور گاؤں میں ہوئی۔ بچپن میں ہی والدین فوت ہوگئے، لہٰذا ان کی پرورش اور تربیت ان کے بڑے بھائی تمیز الدین نے کی جو کانگریس کے ایک فعال ممبر اور ۱۹۳۲ء کی تحریک ترک موالات کا حصہ رہ چکے تھے۔ پھول بہار بی بی نے حب الوطنی کا درس انھیں سے حاصل کیا تھا۔ انھوں نے آزادی کی مختلف تحریکوں میں سرگرم اور فعال حصہ لیا، جس میں پائک پاڑا کے ردردیو کے ساتھ مل کر جلوس نکالنا اور ۱۹۳۲ء میں کانگریس کے ساتھ تحریک ترک موالات میں شریک ہونا قابل ذکر ہے۔ اس کی پاداش میں انہیں چھے مہینے بامشقت جیل کی زندگی بھی گزارنی پڑی۔ انہیں پہلے ڈھاکہ پھر

---

[۱۴] ہندوستان کی جنگ آزادی میں مسلم خواتین کا حصہ، ص: ۸۶-۹۰۔

[۱۵] سرتاج، ڈاکٹر بانو، ہندوستان کی جنگ آزادی میں خواتین، ماڈرن پبلشنگ ہاؤس، نئی دہلی، ۲۰۱۲ء، ص: ۵۲۔

[۱۶] اشرفی، پرویز، ذرا یاد کرو قربانی، اپلائڈ بکس، نئی دہلی، ۲۰۱۷، ص: ۱۴۰۔ William Stephen Raikes Hodson ۱۸۲۱ء میں پیدا ہوا اور ۱۸۵۸ء میں لکھنو میں مارا گیا۔ وہ محکمہ جاسوسی کا سربراہ تھا جو مغل شہزادوں کو قتل کرنے کی وجہ سے بہت مشہور ہوا تھا۔ /(https://www.britannica.com)/ ڈاکٹر عابدہ سمیع الدین، ہندوستان کی جنگ آزادی میں مسلم خواتین کا حصہ، ادارہ تحقیقات اردو، پٹنہ، ۱۹۹۰ء، ص: ۴۷۔

بہرام پور کی جیل میں قید رکھا گیا۔ رہائی کے بعد مزید حوصلے کے ساتھ وہ کانگریس سے جڑی رہیں اور مختلف جلسوں اور جلوسوں میں شامل ہوتی رہیں۔[۱۷]

حسن آرا بیگم: یہ خاتون جنگ آزادی کی مختلف تحریکوں مثلاً "لیڈیز پکیٹنگ بورڈ" کلکتہ، "ناری ستیہ گرہ کمیٹی"، "راشٹریہ مہیلا سنگھ"، اور "نکھل جاتیہ ناری سنگھ" وغیرہ سے منسلک تھیں۔ ان تحریکوں کے تحت انھوں نے نمک ستیہ گرہ کے ذریعہ نمک قانون توڑا۔ وہ ۱۹۳۰ سے ۱۹۳۲ء کے درمیان مختلف جلسوں اور جلوسوں میں شامل ہوتی رہیں اور اپنی ان سرگرمیوں کی وجہ سے قید و بند کی زندگی بھی گزاری۔ حسن آرا بیگم نے سبھاش چندر بوس اور شاعر انقلاب قاضی نذرالاسلام سے متاثر ہو کر گاندھی جی کی تحریکوں میں شرکت کرنا شروع کیا تھا۔ ان سرگرمیوں کے ساتھ ہی وہ حب الوطنی سے سرشار رفاہی کاموں سے بھی جڑی ہوئی تھیں۔ وہ شعر و شاعری کرتی تھیں اور بلا تفریق مذہب و ملت گھر گھر جا کر خواتین کو دیسی بنی ہوئی چیزوں پر زندگی گزارنے پر ابھارتی تھیں۔ ان کا کارنامہ یہ ہے کہ وہ خواتین سے اپیل کیا کرتی تھیں کہ وہ اپنے اپنے گھروں کے مردوں کو انگریزوں کی جیل کی پرواہ کئے بغیر جنگ آزادی میں حصہ لینے کے لیے آمادہ کریں۔ ۱۹۳۲ء میں کلکتہ میدان میں عورتوں کو جمع کر کے اس بہادر خاتون نے یوم آزادی کا اعلان کیا اور برطانوی قوانین کو بھی توڑا۔ پولیس نے انہیں تحریک ترک موالات کے انقلابیوں کے ساتھ پہلے علی پور سنٹرل جیل بعد ازاں بہرام پور میں قید کیا تھا۔ اس میں تقریباً ۱۷۶ خواتین شامل تھیں جن میں چھے مسلم تھیں۔ قید کے دوران انہوں نے کئی انقلابی نظمیں تحریر کیں۔ ان میں "دکھنیر بانی ہو ئینی آج اور کتوا کارِ لکھا" (آزادی کی بانی آج بھی خون سے نہیں لکھی گئی ہے) ہے۔

چوبیس پرگنہ کی گل بہار بی بی اور دکھمون نے ۱۹۳۰ء کی دہائی میں ٹریڈ یونین تحریک میں حصہ لیا تھا۔ دکھمون عالم بازار کی جوٹ میل سے جڑی ہوئی تھیں جبکہ گل بہار بی بی ٹالی گنج رائس میل سے جڑی ہوئی تھیں۔[۱۸]

حلیمہ خاتون: ہندوستان کی جنگ آزادی میں دو قسم کے مجاہدین شامل تھے۔ ایک وہ جنھوں نے عدم تشدد کا راستہ اختیار کیا تھا، جبکہ دوسری قسم ان لوگوں کی تھی جو تشدد پر یقین رکھتے تھے۔ آخر الذکر سے

---

[۱۷] ماخذ سابق، گپت، کملا داس، سدھینتا سنگرامے بنگر ناری، ص: ۲۸۴۔

[18] Anwar Hossain, *Muslim Women's Struggle in Colonial Bengal (1873-1940)*, pp.:224-25.

تعلق رکھنے والی تحریکوں میں بنگال کی ''جُگانتر پارٹی''[۱۹] تھی۔ اس میں ہندو مسلم تمام لوگ شامل تھے۔اس تحریک کی محرک رضیہ خاتون تھیں جن کا ذکر آگے آئے گا۔رضیہ خاتون کے ساتھ میمن سنگھ کی حلیمہ خاتون کا بھی نام آتا ہے، جو ان کے ساتھ مختلف تحریکوں میں شامل رہیں، جلسے جلوسوں کی قیادت کی اور آزادی کی لڑائی میں بھرپور کردار ادا کیا۔ حلیمہ خاتون رضیہ کے ساتھ ۱۹۳۰ء، ۱۹۳۲ء اور ۱۹۴۲ء کی تحریکوں میں شامل تھیں۔[۲۰]

خیر النساء خاتون: اس[۲۱] بنگالی مسلم خاتون نے برطانوی ہند میں سودیشی نظریات کو ایک ایسے وقت میں فروغ دیا جب بنگالی مردوں نے اس جانب کوئی خاص توجہ مبذول نہیں کی تھی۔ خیر النساء (۱۸۷۰-۱۹۱۲) ایک تعلیم یافتہ خاتون تھیں ۔وہ سودیشی تحریک کی ایک پرجوش حامی تھیں انہوں نے اپنی تحریروں کے ذریعے بنگالی خواتین کی حوصلہ افزائی کی۔ انھوں نے بنگالی خواتین پر زور دیا کہ وہ غیر ملکی اشیاء کا استعمال ترک کردیں۔اس سلسلے میں انھوں نے ''سودیشانوراگ'' کے عنوان سے ایک مضمون لکھا تھا، جو ۱۹۰۵ء کے رسالہ '' نبنور'' میں شائع ہوا تھا۔اسی طرح انھوں نے سودیشی تحریک اور بنگال میں مقامی صنعت کو فروغ دینے کے مقصد سے عوام اور خصوصاً خواتین کو ابھارا۔[۲۲] انھوں نے خواتین پر زور دیا کہ وہ غیر ملکی کپڑے، کاسمیٹکس، سجاوٹ کے سامان یا برتن نہ خریدیں۔انھوں نے خواتین سے یہ گزارش کی کہ لیونڈر کی خوشبو کے بجائے گلاب کی خوشبو استعمال کریں۔انھوں نے یہ بھی کہا کہ ممبائی،

---

[۱۹] یہ پارٹی ''آتما اُنتی انوشیلن'' تحریک کی ایک شاخ تھی، جو غدر اور دیوبندی تحریک سے مماثلت رکھتی تھی۔ اسے ۱۹۰۰ سے ۱۹۰۹ء کے درمیان قائم کیا گیا تھا۔اس سے خدی رام بوس بھی منسلک تھے۔ جگانتر کے نام سے ایک ہفتہ واری انقلابی رسالہ بھی شائع ہوتا تھا۔ *Freedom Movement and Indian Muslims*, Ray Santimay, pp.:33-41.

[۲۰] گپت، کملاداس، سدھینتا سنگر امے بنگلر نری، ص: ۲۸۴۔

[۲۱] بی بی خیر النساء خاتون سراج گنج کے ایک متوسط گھرانے میں پیدا ہوئی تھی۔ وہ ''حسین پور بلیکا بدیالیہ'' کی صدر مدرسہ تھی۔ جو لوگ اپنے بچیوں کو پردے کی وجہ سے اسکول نہیں بھیجتے تھے، خیر النساان بچیوں کو رات میں ان کے گھروں سے لاتی تھیں اور پڑھا کر واپس چھوڑ آتی تھیں۔انھوں نے تعلیم، حقوق نسواں اور دیگر موضوعات پر کئی مضامین لکھے جو کلکتہ کے نبنور رسالہ میں شائع ہوئی تھی۔ (Hossain, Dr. Saika, *The Writings of the Bengali Muslim Women in Colonial Bengal*, International Journal of Humanities and Social Science Invention, V:11, Issue:12 Dec 2022, p:3.)

[۲۲] Hossain, Dr. Saika, *The Bengali Muslim Women's Struggle for Freedom(1905-1930)*, pp.:51-52.

ڈھاکہ، پبنا، مرشدآباد اور نادیا کے بنے ہوئے کپڑے خریدیں۔[۲۳] خیر النساء نے تاکید کے ساتھ لکھا کہ سودیشی تحریک سے غریب مسلمانوں کو فائدہ پہنچے گا کیونکہ اس سے معاشی بحران کم ہوگا اور گھریلو صنعتی ترقی ہوگی۔ ابتدائی مسلم خاتون مصنفین میں، خیر النساء شاید پہلی خاتون تھیں جنہوں نے عصری سماجی اور سیاسی مسائل پر اپنی رائے کا اظہار کیا۔ انھوں نے ۱۹۰۵ء کی تقسیم بنگال کے خلاف بھی آواز بلند کی تھی۔[۲۴]

دولۃالنساءخاتون: جون ۱۹۱۸ء میں بوگورہ ضلع (موجودہ بنگلہ دیش) کے سوناتلہ گاؤں میں پیدا ہوئیں۔ ان کے والد کا نام محمد یاسین اور والدہ کا نام نورالنساء خاتون تھا۔ والدین نے کم عمری میں ان کی شادی کرادی جب وہ صرف آٹھ سال کی تھیں اور لووَر پرائمری امتحان میں کامیاب ہو کر وظیفہ حاصل کیا تھا۔ ان کی شادی جیسور ضلع کے محکمہ ماگورہ کے باشندہ ڈاکٹر حفیظ الرحمان سے ہوئی۔ حالاں کہ اس زمانے میں خواتین کی اعلی تعلیم کا رجحان نہیں تھا، اس کے باوجود والدین نے رسم و رواج کے خلاف جاکر بارہ سال کی عمر تک ''ڈھاکہ ایڈن ہائی اسکول'' میں انہیں تعلیم دلائی۔ اس کے بعد ان کی رخصتی ہوئی۔

دولۃالنساء خاتون کو علم سے خاص شغف تھا لہذا سسرال میں بھی انھوں نے ذاتی مطالعہ جاری رکھا۔ دولۃالنساء خاتون بارہ سال کی عمر سے ہی جنگ آزادی کی مختلف تحریکوں میں حصہ لینے لگی تھیں۔ وہ ۱۹۳۰ء میں نمک ستیہ گرہ کے جلوس میں شامل تھیں۔ ۱۹۳۲ء میں ''تحریک ترک موالات'' چلی تو انہوں نے دیگر خواتین کے ساتھ مل کر ''گائے باندھا مہیلا سمیتی'' قائم کی۔ اس وقت ان کی عمر محض چودہ سال تھی مگر وہ ذمہ داریوں سے بخوبی واقف تھیں۔ وہ خود اس سمیتی کی سکریٹری بنیں، صدر مہامایا اور نائب صدر دکھو بالہ داس مقرر ہوئیں۔ یہ سمیتی جلوس، پکٹنگ، دفعہ ۱۴۴ کو ناکام کرنا اور عوام میں آزادی کا شعور پیدا کرنے کی کوشش کرتی تھی۔ اس میں آس پاس کے تقریباً آٹھ گاؤں (بمن ڈنگا، سُرتخالی، نال ڈنگا، وجئے ڈنگا، پھل چھڑی، کپ تالا، تلسی گھاٹ وغیرہ) کی خواتین شامل تھیں۔ دولۃالنساء جب ان گاؤوں میں تقریر کرنے جاتی تھیں تو گاؤں کی تمام ہندو و مسلم عورتیں ان کی تقریر سننے کے لیے جمع ہو جایا کرتی تھیں۔ تمام لوگ ایک باپردہ اور کم عمر خاتون کے جذبے سے بہت متاثر

---

[۲۳] خیر النساء، سودیشانوراگ (بنگلہ مضمون)، نبنور، کلکتہ، ۱۳۱۲ بنگلہ تاریخ، ص: ۲۷۸۔ یہ ایک ماہانہ رسالہ تھا۔ اسے مولوی سید امداد علی شائع کرتے تھے۔

[۲۴] Anwar Hossain, *Muslim Women's Struggle in Colonial Bengal (1873-1940)*, pp.:215-16.

تھے۔ وہ سب کو اپنی پرجوش تقریروں سے سمیتی سے منسلک ہونے کی جانب راغب کر لیا کرتی تھیں۔[۲۵]

ایک دفعہ پولیس نے ان کے شوہر کو گرفتار کرلیا اور گھر بھی ضبط کرلیا۔اس کے باوجود وہ کبھی بھی پیچھے نہیں ہٹیں، بلکہ اس کے لیے بھی انہوں نے شہر کی شاہ راہ پر صدائے احتجاج بلند کی۔ گرفتار کر کے ان کو، مہامایا بھٹاچاریہ اور پر تیبھا سرکار کو پہلے راجشاہی پھر بہرام پور کی جیل میں رکھا گیا۔ان کی تحریک سے منسلک ضیاء النھار، رقیبہ خاتون، شمس النھار اور رقیہ خاتون بھی تھیں مگر انہیں پولس گرفتار نہیں کر پائی تھی۔ مذکورہ خواتین نے دولۃ النساء کی غیر موجودگی میں کچھ دنوں تک تحریک کو زندہ رکھنے کی کوشش کی۔[۲۶] رہائی کے بعد انہوں نے تحریک کو غیر متحرک پایا لہذا انھوں نے دوبارہ پڑھائی شروع کی اور بی۔اے پاس کیا۔ ساتھ ہی وہ سمیتی کے لئے بھی کام کرتی رہیں اور رفاہی کاموں پر دھیان دینے لگیں۔انہوں نے ۱۹۴۳ء کی قحط سالی کے دوران ''مہیلا آتمار کشا سمیتی'' تشکیل دی تھی۔[۲۷] انھوں نے کئی ادبی کہانیاں بھی لکھی ہیں۔ تقسیم ہند کے بعد انھوں نے ڈھاکہ میں سکونت اختیار کرلی اور مختلف سرکاری ورفاہی کاموں سے منسلک رہیں۔ ۴؍ اگست ۱۹۹۷ء کو انھوں نے اس دار فانی کو الوداع کہا۔[۲۸]

رادو بی بی: جنگ آزادی میں پیش پیش رہیں۔ کلکتہ کی خواتین نے ''مہیلا کرما سماج'' تحریک قائم کی تھی۔اس کے تحت خواتین گھر گھر جا کر عوام کو آزادی کے لئے ابھارتی تھیں۔اس تحریک کے تحت پچیس سے تیس خواتین کی جماعت بنا کر انہیں چند گھر دے دئے جاتے تھے۔اس تحریک کے نتیجے میں قائم ہونے والی انجمنوں میں سے اندر پر بھا مجمدار اور رادو بی بی کی انجمن بہت معروف ہیں۔اس انجمن میں شامل خواتین کی ایک بڑی تعداد نے مذکورہ بالا شخصیات کی اپیل پر اپنے زیورات اتار دیے اور اپنی چوڑیاں توڑ دیں اور یہ عہد کیا کہ جب تک آزادی نہیں مل جاتی تب تک وہ زیورات نہیں پہنیں گی۔[۲۹]

---

[۲۵] گپت، کملا داس، سدھینتا سنگرامے بنگلر ناری، ص: ۲۱۱۔

[۲۶] Hossain, Dr. Saika, *The Bengali Muslim Women's Struggle for Freedom (1905-1930)*, p:53.

[۲۷] Anwar Hossain, *Muslim Women's Struggle in Colonial Bengal (1873-1940)*, pp.:223-24.

[۲۸] گپت، کملا داس، سدھینتا سنگرامے بنگلر ناری ص: ۲۱۰-۲۱۱۔

[۲۹] Kaur, Manmohan, *Role of Women in the Freedom Movement (1857-1947)*, p:150.

رضیہ خاتون: جُگانتر پارٹی میں جمال پور (موجودہ میمن سنگھ، بنگلہ دیش) کی رضیہ خاتون اپنے والد نصیر الدین احمد ودیگر کے ساتھ جنگ آزادی میں شامل تھیں۔ نصیر الدین اس پارٹی کے علاقائی لیڈر تھے۔ رضیہ خاتون مختلف حملوں میں شریک ہوتی تھیں۔ آخر میں ان کو گرفتار کر لیا گیا اور جیل کی با مشقت سزا دی گئی۔[۳۰] لیکن جیل کی سزا بھی انہیں ان کے مقصد سے دور نہیں کر سکی، بلکہ وہ مزید فعال ہو گئیں۔ انھیں سیاسی سرگرمیوں میں حصہ لینے والی بنگال کی پہلی مسلم خاتون ہونے کا شرف حاصل ہے۔ رضیہ خاتون نے آزادی کی جنگ میں نمایاں کردار ادا کیا۔ انقلابیوں کی ہر قسم کی مدد کے لیے وہ ہمہ وقت تیار رہتیں۔ وہ کئی دفعہ گرفتار ہوئیں اور جیل کی صعوبتیں برداشت کیں۔[۳۱] انھوں نے ۱۹۳۰ء، ۱۹۳۲ء اور ۱۹۴۲ء کی تحریکوں میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا۔ اس کام میں حلیمہ خاتون (جن کا ذکر پہلے ہو چکا ہے) ان کے ساتھ ہوا کرتی تھیں۔[۳۲]

رضیہ خاتون چودھرانی: رضیہ خاتون چودھرانی ۱۹۰۷ء میں نواکھالی ضلع (موجودہ بنگلہ دیش) میں پیدا ہوئیں۔ ان کے والد عبدالرشید کلکتہ کارپوریشن کے میئر چِتور نجن داس کے ساتھ ڈپٹی اکزیکیٹیو افسر کی حیثیت سے کام کرتے تھے۔ رضیہ کا بچپن کلکتہ میں گزرا اور ان کی ابتدائی تعلیم نواکھالی میں ہوئی۔ وہ عربی، فارسی، اردو، بنگلہ اور انگریزی زبانیں جانتی تھیں۔ ان کی شادی کومیلا کے ایک زمین دار گھرانے میں اشرف الدین احمد چودھری سے ہوئی۔ اشرف الدین تحریک آزادیٔ ہند کے ایک فعال رکن تھے۔ رضیہ تعلیم یافتہ خاتون تھیں۔ وہ چھوٹی چھوٹی کہانیاں لکھنے کی وجہ سے معروف تھیں۔ انہوں نے اپنی کہانیوں میں مسلم خواتین کی تعلیم، معاشرے میں ان کی حیثیت اور پردہ وغیرہ جیسی سماجی رسومات سے آزادی کی بات کی۔ اس سلسلے میں ان کا ایک مضمون ''سماجے و گریہے ناریر استھان'' (سماج و گھر میں خواتین کا مقام) بہت مشہور ہوا۔ ان کی سیاسی بصیرت کا اندازہ ان کی ایک اور تحریر ''شرومک'' (مزدور) سے ہوتا ہے۔ اس میں انھوں نے تحریک خلافت اور ''سودیشی تحریک'' کی اہمیت و ضرورت پر بات کی۔[۳۳] وہ

---

[۳۰] Ray, Santimay, *Freedom Movement and Indian Muslims*, p:44.

[۳۱] ہندوستان کی جنگ آزادی میں خواتین، ص: ۱۶۰۔

[۳۲] گپت، کملاداس، سدھینتا سنگرامے بنگر ناری، ص: ۲۸۴۔ Mukhapadhyay, Apurva, *Women, Society and Politics: A Study of South Asia*, Avenel Press, 2018. مضمون نگار کرشنا چندرا گھوس، بھاروتیر سادھی نوتا سنگرامے مسلم ناریدیر وبودان (ہندوستان کی تحریک آزادی میں مسلم خواتین کا کردار)، ص: ۱۶۱۔

[۳۳] Hossain, Saika, "*Reading Between the Lines: The Writings of the Bengali Muslim*

دیسی چیزوں کے فروغ پر مضامین لکھتی تھیں۔ اور خود کھادی پہنتی تھیں، حتی کہ انہوں نے اپنی شادی میں بھی کھادی کی ساڑھی پہنی تھی۔ وہ تقسیم بنگال کے خلاف ہونے والے مختلف احتجاجوں اور جلوسوں میں حصہ لیتی تھیں، اور ہندوستانی قومیت کی خاطر لڑنے والوں کی مدد کے لئے چندہ بھی اکٹھا کرتی تھیں۔ ۱۹۳۴ء[۳۴] میں محض ۷۲ سال کی عمر میں ان کی وفات ہوگئی۔

رعنا بانو: ۱۸۸۸ء میں موضع باموتارا، ضلع مدناپور مغربی بنگال میں پیدا ہوئیں۔ انھوں نے ہندوستان چھوڑو تحریک ۱۹۴۲ء میں حصہ لیا۔ ۲۷، ستمبر ۱۹۴۲ء کو ایشور پور کے جلوس میں نندی گرام پولیس اسٹیشن پر حملہ کے دوران پولیس کی فائرنگ سے زخمی ہوئیں اور ملک کے لیے شہادت کا درجہ نصیب ہوا۔[۳۵]

رقیہ بیگم: ۱۸۸۰ء میں رنگ پور ضلع کے پئیر بندھا گاؤں میں پیدا ہوئیں۔ ان کا خاندان صابری کے نام سے معروف تھا۔ ان کی شادی سخاوت حسین سے ہوئی جو وسیع الذہن اور خواتین کی تعلیم کے حامی تھے۔ یوں رقیہ بیگم کا جنگ آزادی سے بلاواسطہ تعلق نہیں تھا مگر بالواسطہ ضرور تھا۔ وہ نہ صرف خواتین کی تعلیم کے لیے جدوجہد کرتی رہی تھیں بلکہ عورتوں میں ہر قسم کی بیداری عام کرنے میں ہمیشہ کوشاں رہتی تھیں۔ ان کے قائم کردہ اسکول ''سخاوت میموریل اسکول'' سے پڑھی ہوئی خواتین نے جنگ آزادی میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا۔ انہوں نے کئی کتابیں تصنیف کیں، مثلاً موتیچور، پدوراگ، وبورودھ بسینی، سلطانر سپنو، مکتی پھل وغیرہ۔ آخر الذکر کتاب میں انھوں نے لکھا ہے کہ خواتین کی مدد کے بغیر محض مرد کی کوشش سے آزادی حاصل کرنا ممکن نہیں ہے۔[۳۶] اس کے علاوہ جنگ آزادی میں شہید ہونے والوں کا انھوں نے اپنے مضامین و تصانیف میں محبت و جذبات کے ساتھ ذکر کیا ہے۔ ان کی وفات ۵۲ سال کی عمر میں ۹ دسمبر ۱۹۳۲ء کو ہوئی۔[۳۷]

Women in Colonia Bengal', International Journal of Humanities & Social Science, Vol: VII, Issue: I, July 2018, p:273.

[۳۴] Hossain, Dr. Saika, *The Bengali Muslim Women's Struggle for Freedom (1905-1930)*, p:52.

[۳۵] ابراہیمی، ڈاکٹر ایم۔ اے، جنگ آزادی کے مسلم شہدا، ایجوکیشنل پبلیشنگ ہاؤس، دہلی، ص: ۴۶۔

[۳۶] گپت، کملاداس، سدھینتا سنگرامے بنگلر نری، ص: ۲۸۶۔

[۳۷] Hakeem, Shagufta F., *The Writings of Rokeya Hossain A Pioneer of her time whose Writings hold Relevance Today*, Duke University/ Graduate Liberal Studies, 2015,

انھوں نے اپنی کتاب ''نِریہو بنگالی''(۱۹۰۴ء) میں لکھا ہے کہ تمام بنگالی ایک ہی نسل سے ہیں۔اسی طرح انھوں نے اپنی ایک نظم ''نِروپم ویر'' میں ایک ہندو انقلابی شخص کنئی لال کا مرثیہ پیش کیا ہے۔ اس سے ان کی حب الوطنی کا پتہ چلتا ہے۔ کنئی لال کو برطانوی حکومت نے تقسیم بنگال کے خلاف بغاوت کرنے کے الزام میں موت کی سزا سنائی تھی۔انھوں نے ایک تمثیل ''مکتی پھل''(۱۹۲۱ء) میں بتایا کہ ہندو مسلم اتحاد کے بغیر آزادی ملنے کا امکان بہت ہی کم ہے۔ اسی طرح ایک نظم ''اپیل''(۱۹۲۲ء) میں بھدر لوک (ہندوؤں کا اعلیٰ طبقہ) کو آزادی کی تحریکوں میں انگریزوں کے تئیں وفاداری اور حکومت کی جانب سے حاصل شدہ امتیازات و تمغات کو بچانے کے لیے آزادی کی تحریکوں میں شامل نہ ہونے کی وجہ سے سختی سے سرزنش کی ہے۔[۳۸]

زبیدہ خاتون چودھرانی: ۱۹۰۱ء میں پیدا ہوئیں۔ وہ گھر کے سخت ماحول کی بنا پر کوئی خاص تعلیم حاصل نہیں کر سکی تھیں۔ان کی شادی اٹھارہ سال کی عمر میں خان بہادر عبدالرحیم چودھری سے ہو گئی تھی۔[۳۹] زبیدہ کا شمار بنگال کی ان خواتین میں ہوتا ہے جنھوں نے ۱۹۳۰ء سے ۱۹۳۲ء کے درمیان چلنے والی انگریز مخالف مختلف تحریکوں میں شرکت کی۔ وہ ۱۹۲۷ء میں سلہٹ کی ایک مجلس میں قاضی نذرالاسلام، اے۔کے فضل الحق اور ڈاکٹر محمد سعداللہ سے ملیں، جس سے ان کے اندر مزید حب الوطنی پیدا ہوئی۔ انھوں نے ۱۹۲۸ء میں وفیشیلی کانگریس میں شرکت کی تھی۔وہ ''شری ہٹا مہیلا سنگھ'' کی صدر تھیں جو کانگریس کے ساتھ مل کر کام کرتی تھی۔اس کے علاوہ انھوں نے مختلف احتجاجوں میں حصہ لیا۔انھوں نے ہمیشہ ہندو مسلم اتحاد کو فروغ دیا، دفعہ ۱۴۴ کو ہمیشہ توڑا اور کسانوں کی تحریکوں، مثلاً ''بھانو بل تحریک'' وغیرہ میں شرکت کی۔[۴۰]

زلیخا بیگم ۱۸۹۴ء میں بنگال میں پیدا ہوئیں۔ان کے والد کا نام آفتاب الدین تھا جو بغداد سے ہندوستان

---

p:12. انھوں نے اپنی زندگی کی آخری سال میں علی گڑھ کی ''انڈین ویمنس کانفرنس'' کی قیادت کی تھی۔ مزید اسی سال ''ناریر ودھیکار'' (حقوق نسواں) پر ایک اہم کتاب تصنیف کی تھی (ماخذ سابق)۔

[۳۸] Anwar Hossain, *Muslim Women's Struggle in Colonial Bengal (1873-1940)*, pp.:220-21.

[۳۹] *Ibid*, p:222.

[۴۰] Hossain, Dr. Saika, *The Bengali Muslim Women's Struggle for Freedom (1905-1930)*, p:53.

ہجرت کرکے آئے تھے اور کلکتہ میں آباد ہوگئے تھے۔ان کی شادی ۱۹۰۰ء میں معروف مجاہد آزادی مولانا ابوالکلام آزاد (۱۸۸۸-۱۹۵۸) سے ہوئی تھی۔ مولانا آزاد کو مذہب و سیاست میں بڑا اہم مقام حاصل ہے۔جنگ آزادی میں مولانا کا بار بار جیل جانا، معاشی مشکلات کا سامنا کرنا، تنہائی کی زندگی برداشت کرنا وغیرہ زلیخا بیگم کے لئے بڑی سخت امتحان کی گھڑیاں ہوتی تھیں، لیکن وہ تمام امتحانوں میں ہنسی خوشی کامیاب ہوتی گئیں اور کبھی کوئی حرف شکایت زبان پر نہیں لائیں۔ مولانا خود اقرار کرتے ہیں کہ ''اس ''زلیخا بیگم'' نے صرف ساتھ ہی نہیں دیا بلکہ پوری ہمت واستقامت سے ہر طرح کے ناخوشگوار حالات برداشت کئے۔ وہ دماغی حیثیت سے میرے افکار وعقائد میں شریک تھیں اور عملی زندگی میں رفیق و مددگار''۔[۴۱]

زلیخا بیگم کی جرأت اور حب الوطنی کا ثبوت ان کے اس خط سے ملتا ہے جسے انہوں نے مولانا کی دوسری گرفتاری کے سلسلے میں مقدمہ کا فیصلہ سننے کے بعد مہاتما گاندھی کو بھیجا تھا۔وہ لکھتی ہیں:

> میرے شوہر مولانا ابوالکلام آزاد کے مقدمے کا فیصلہ آج سنایا گیا۔انہیں صرف ایک سال کی قید با مشقت کی سزا دی گئی۔ یہ سزا اس سے بدرجہا کم ہے جسے سننے کے لئے ہم تیار تھے۔اگر سزا اور قید، قومی خدمت کا معاوضہ ہے تو آپ تسلیم کریں گے کہ اس معاملے میں بھی ان کے ساتھ سخت نا انصافی کی گئی ہے۔ یہ تو کم سے کم بھی نہیں جس کے وہ مستحق تھے۔ میں آپ کو اطلاع دینے کی جرأت کرتی ہوں کہ ان کی گرفتاری کے سبب بنگال میں ان کی خدمات کی جو جگہ خالی ہوئی ہے اس کے لئے میں نے اپنی ناچیز خدمات پیش کردی ہیں اور وہ تمام کام بدستور جاری رہیں گے جو ان کی موجودگی میں انجام پاتے تھے...... میری صحت کے مد نظر گرچہ مولانا نہیں چاہتے کہ میں محنت و مشغولیت کے کاموں میں حصہ لوں لیکن میں نے ارادہ کرلیا ہے کہ اس سزایابی کے بعد مجھے اپنی ناچیز ہستی کو ادائے فرض کے لئے وقف کردینا چاہیے۔[۴۲]

اس سے پتہ چلتا ہے کہ زلیخا بیگم اس وقت کے ہندوستانی سیاسی ماحول سے پوری طرح واقف تھیں۔ مزید انھوں نے نہ صرف مولانا آزاد کا ہر اعتبار سے ساتھ دیا بلکہ انہوں نے بنفس نفیس جنگ آزادی میں

---

[۴۱] ہرگانوی، مناظر عاشق، ابوالکلام آزاد کی وفا شعار شریک حیات: زلیخا بیگم، (مولانا آزاد نمبر)، ایوان اردو، دہلی، دسمبر ۱۹۸۸ء، ص: ۹۱۔

[۴۲] ہندوستان کی جنگ آزادی میں مسلم خواتین کا حصہ، ص: ۱۶۵-۱۶۴۔ / فضل حق عظیم، خواتین ہند کے تاریخی کارنامے، ص: ۱۹۴-۱۹۵۔

مولانا کی غیر موجودگی میں فعال حصہ بھی لیا۔ زلیخا بیگم مسلسل تنہائی اور بیماری کی زندگی جینے کے بعد ۹؍ اپریل ۱۹۴۳ء کو اس دنیا سے رخصت ہو گئیں۔ اس دوران مولانا آزاد احمد نگر کی جیل میں قید تھے۔[۴۳]

زہرہ بیگم و سلطانہ بیگم: یہ دونوں بہنیں بنگال کے پروفیسر عبدالرحیم کی صاحبزادیاں تھیں۔ گاندھی جی کی دعوت پر گھیراؤ (Picketing) کرنے کے جرم میں یہ ۱۹۳۰ء میں گرفتار کر لی گئیں۔ گرفتاری دینے والوں میں غالباً یہ اولین خواتین تھیں۔[۴۴] عابدہ بانو بیگم نے ابھودایہ کا مضمون "Women in India's Freedom Struggle" (۳۰؍ اگست ۱۹۳۰ء) کے حوالے سے لکھا ہے کہ یہ دونوں پہلی خواتین ہیں جن کی گرفتاری ہوئی تھی۔ ان کے والد آل انڈیا کانگریس کمیٹی کے ممبر تھے۔ ان دونوں کو شراب اور برطانوی کپڑوں کی دوکانوں کے سامنے احتجاج کرنے اور انھیں بند کرانے کے جرم میں گرفتار کیا گیا تھا۔[۴۵]

ماتنگنی ہاجرہ: ۱۸۶۹ء میں شہر تام لک[۴۶] (مدناپور، مغربی بنگال) کے گاؤں ہوگلا میں پیدا ہوئیں۔ غربت کے سبب والدین نے محض ۱۲ سال کی عمر میں ایک سن رسیدہ شخص سے شادی کر دی تا کہ ہاجرہ کبھی بھوکی نہ رہے، مگر وہ ۱۸ سال کی عمر میں بیوہ ہو گئیں اور عمر میں ان سے بڑے سوتیلے بیٹوں نے انھیں نہ صرف جائداد سے محروم کیا بلکہ گھر سے بھی باہر کر دیا۔ لہذا ہاجرہ جھونپڑی میں رہ کر مزدوری کر کے زندگی بسر کرنے لگیں۔ بیسویں صدی عیسوی کی ابتدائی دہائیوں میں گاندھی جی کی قیادت میں ملک بھر کے اندر انقلابی محرکین نے مختلف شہروں اور گاؤوں میں جلوس نکالے۔ انہی جلوسوں میں سے کسی میں ہاجرہ شامل ہو گئیں اور اس میں موجود رہنماؤں کی تقاریر سنیں تو ان کا دل بھر آیا، چنانچہ اسی وقت انہوں نے ملک کو آزادی دلانے کی کوشش میں شامل ہونے کا فیصلہ کیا۔ اس سے وہ آخر دم تک منسلک رہیں۔[۴۷]

ماتنگنی ہاجرہ کانگریس کی سرگرم و فعال ممبر کی حیثیت سے مختلف تحریکوں میں شریک ہوئیں۔ وہ خود چرخا چلاتی تھیں اور کھادی پہنتی تھیں۔ انھوں نے نمک ستیہ گرہ میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا، اور نمک

---

[۴۳] ہندوستان کی جنگ آزادی میں خواتین، ص: ۱۲۰۔

[۴۴] آبادی، فضل حق عظیم، خواتین ہند کے تاریخی کارنامے، بہار پبلیکیشن نیاٹولہ، پٹنہ، ۱۹۹۸ء، ص: ۱۸۷۔

[۴۵] ہندوستان کی جنگ آزادی میں مسلم خواتین کا حصہ، ص: ۲۸۹۔

[۴۶] تام لک شہر کو جنگ آزادی کا بہت فعال علاقہ مانا جاتا ہے۔ یہ شہر ساحل سمندر پر واقع ہے۔ Bera, Sanjib, *"Freedom Struggle in India: Midnapore (1905-1934)"*, Pramana Research Journal, vol:9, issue:1, 2019, p:445.

[۴۷] سرتاج، ڈاکٹر بانو، ہندوستان کی جنگ آزادی میں خواتین، ماڈرن پبلشنگ ہاؤس، نئی دہلی، ۲۰۱۲ء، ص: ۴۵-۴۶۔

بنا کر نمک قانون توڑا جس کی پاداش میں گرفتار بھی ہوئیں۔ پولیس انہیں سزا کے طور پر دور دور تک پیدل چلواتی تھی یہاں تک کہ وہ تھک کر گر پڑتی تھیں۔ قید سے رہائی کے بعد چوکیداری ٹیکس کے خلاف جلوس میں شریک ہوئیں تو پولیس نے ان کو دوبارہ گرفتار کرلیا۔ انھوں نے مئی ۱۹۳۰ء میں مدنی پور میں چلنے والی تحریک ترک موالات میں شرکت کی تھی۔[۴۸] اسی طرح وہ کانگریس کے مختلف اجلاسوں میں شامل ہونے کے لئے ہندوستان کے مختلف علاقوں کا سفر بھی کیا کرتی تھیں۔ انھوں نے ۱۹۳۳ء میں سیرام پور (ہگلی، مغربی بنگال) میں منعقد ہونے والے کانگریس کے مہاکمبھ سمیلن میں بھی حصہ لیا۔ پولیس نے اس میں شامل لوگوں پر لاٹھی چارج کیا جس میں وہ بری طرح زخمی ہوگئی تھیں۔ جب گاندھی جی نے ۱۹۴۲ء میں ''بھارت چھوڑو'' تحریک چلائی تو تام لک کے تقریباً پچیس ہزار افراد نے، جن میں تقریباً چھے ہزار خواتین تھیں، پورے شہر میں جلوس نکالا، ہڑتال کی اور مختلف سرکاری محکموں پر قبضہ کرلیا۔ عدالت پر قبضہ کرنے والی جماعت کی، جس میں تقریباً پانچ ہزار افراد شامل تھے اور جن میں اکثریت خواتین کی تھی، قیادت ہاجرہ کررہی تھیں۔ جب ان کا جلوس عدالت کے قریب پہنچا تو پولس سارجنٹ نے دفعہ ۱۴۴ کا اعلان کرکے گولی چلانے کی دھمکی دی۔ اس صورت حال میں ہاجرہ نے ساتھ کی عورتوں کو رکنے کو کہا اور خود بلاخوف وخطر آگے بڑھتے ہوئے چلاکر کہا ''ہم نہتے ہیں۔ گولی نہ چلانا''، مگر پولیس نے ان کے بازو پر گولی چلادی پر وہ رکی نہیں پولیس نے دوسری گولی چلائی پھر بھی نہیں رکیں آخر ایک گولی ان کے سر پر لگی مگر انھوں نے ترنگے کو ہاتھ سے گرنے نہیں دیا، جب کسی نے ان کے ہاتھ سے پرچم سنبھالا تب وہ زمین پر گر پڑیں۔[۴۹] قربانی کے اس منظر کو دیکھ کر بھیڑ بے قابو ہوگئی اور ہلہ بول کر عدالت پر قبضہ کرلیا۔ اس طرح تام لک پر ۱۹۴۴ء تک عوام کی حکومت قائم رہی مگر گاندھی جی کے اصرار پر اسے ختم کردیا گیا۔ بہر حال ماتنگنی ہاجرہ تقریباً ۷۳ سال کی عمر میں حب وطن میں شہید ہوگئیں۔[۵۰]

ہاجرہ ایک جانباز خاتون ہونے کے ساتھ ساتھ ایک بہت ہی دردمند انسان بھی تھیں۔ ۱۹۳۳ء میں جب پورے ملک میں طاعون کی وبا پھیلی تو انہوں نے متاثرہ لوگوں کی خوب مدد کی تھی۔ اس میں انھوں نے ملکی و

---

[۴۸] Bera, Sanjib, *Freedom Struggle in India: Midnapore (1905-1934)*, p:443.

[۴۹] Manmohan, *Role of Women in the Freedom Movement (1857-1947)*, p:214.

[۵۰] سرتاج، ڈاکٹر بانو، ہندوستان کی جنگ آزادی میں خواتین، ص: ۴۶-۴۷۔

غیر ملکی بھید بھاؤ کے بغیر مختلف انگریزی افسروں اوران کے خاندان کے افراد کی بھی خدمت کی تھی۔[۵۱]

ماجدہ حسینہ بیگم: ان کا تعلق کلکتہ سے تھا۔ وہ نہایت غریب گھرانے سے تھیں۔ اس کے باوجود وہ غیر معمولی جرأت وہمت رکھتی تھیں۔ انھوں نے ہمیشہ پولیس کے مظالم اور برطانوی حکومت کی ناانصافیوں کے خلاف آواز اٹھائی، جس کے سبب وہ دو دفعہ گرفتار ہوئیں اور قید کی زندگی گزاری۔[۵۲] ان کا نصب العین واضح تھا۔ وہ عوام کے حقوق کی علمبردار تھیں۔ دوسری عالمی جنگ کے دوران جیل گئیں اور رہائی کے بعد پھر پولیس کے مظالم، سماجی عدم مساوات اور مسلم لیگ کے فرقہ وارانہ تعصب کے خلاف نبرد آزما ہو گئیں۔[۵۳]

دیگر مسلم خواتین: وہ خواتین جنہوں نے جنگ آزادی میں حصہ لیا مگر ان سے متعلق معلومات بہت کم دستیاب ہیں، ان میں ڈھاکہ کے غلام جیلانی[۵۴] کی والدہ شمس النسا بیگم اور ان کی اہلیہ روشن آرا بیگم کے نام نمایاں ہیں۔ ان کے علاوہ ڈھاکہ کے آصف علی بیگ کی اہلیہ رئیسہ بانو بیگم اور اختر الدین حسین چودھری کی اہلیہ بدرالنسا بیگم اس اعتبار سے اہم ہیں کہ ۱۹۳۰ء سے ۱۹۳۲ء کے درمیان چلنے والی تحریکوں میں یہ دونوں نہ صرف بہ نفس نفیس شامل تھیں، بلکہ انھوں نے خوب مالی تعاون بھی فراہم کیا، یہاں تک کہ انھوں نے اپنے زیورات تک اتار کے آزادی کی تحریک میں دے دیے تھے۔[۵۵] اسی طرح فضیلۃ النساء، حمیدہ خانم، نورالنساء خاتون ودیا بنودنی،[۵۶] بیگم قیوم،[۵۷] اور جحیم النساء خاتون جنگ آزادی کی مختلف تحریکوں میں شامل تھیں۔ آخر الذکر کو کلکتہ کی جیل میں قید کیا گیا تھا۔ بنابی بی کو ۱۹۳۲ء میں مدناپور کی پولیس نے قید کر لیا اور ان کے ساتھ بدسلوکی بھی کی تھی۔ اسی طرح جلپائی گڑی کی لیلی احمد، جن کے شوہر کا نام عبد

---

[۵۱] ماخذ سابق، ص: ۷۴۔

[۵۲] ماخذ سابق، ص: ۲۰۸۔

[۵۳] Ray, Santimay, *Freedom Movement and Indian Muslims*, People's Publishing House, 1979, pp. 84-85.

[۵۴] غلام جیلانی ۱۹۳۲ء میں کانگریس کی تحریکوں سے جڑے رہنے کے سبب برطانوی حکومت نے انہیں قید کر دیا تھا۔ ان کا انتقال جیل ہی میں ہوا تھا۔ (ماخذ سابق، گپت، کملاداس، سدھینتا سنگرامے بنگلر نری، ص: ۲۸۵۔)

[۵۵] ماخذ سابق۔

[۵۶] Hossain, Dr. Saika, *The Bengali Muslim Women's Struggle for Freedom (1905-1930)*, p:53.

[۵۷] *Bengal Women in Anti-British Movement (1857-1947): A Historical Analysis*, p:556.

الصمد تھا اور جو لیجسلٹیو اسمبلی کے ممبر تھے، بردوان کی مقصودہ بیگم، جن کے شوہر کا نام منصور حبیب اللہ تھا، کلکتہ کے قطب الدین احمد، جو کسانوں کے حقوق کے لئے لڑتے تھے، کی بہن ناظم النساء۔ یہ عورتیں کلکتہ کی غریب بستیوں میں جا جا کر لوگوں کو آزادی کے لیے ابھارتی تھیں۔[۵۸] ان کے علاوہ بہت سی بنگالی مسلم خواتین ہیں جنھوں نے تحریک آزادی میں حصہ لیا جن کے نام یا تو جیلوں کے رجسٹروں میں درج ہیں یا پھر وہ پوری طرح گم نام ہیں۔

خلاصہ کلام: اس مضمون میں جنگ آزادی میں حصہ لینے والی معدودے چند بنگالی مسلم خواتین کا ذکر کیا گیا ہے۔اس کی سب سے بڑی وجہ ان سے متعلق مواد کی کمیابی یا عدم دستیابی ہے۔ایک دوسری بڑی وجہ مسلم معاشرے کی خود اپنی تاریخ سے عدم دلچسپی ہے۔ ایک سبب یہ بھی رہا ہے کہ بنگال کے ہندو قائدین نے نیشنلزم کو مذہبی رنگ دے کر پیش کیا، مثلاً اروبندو گھوس نے تحریک آزادی کو کالی ماں سے تشبیہ دے کر پیش کیا، یا بپن چندر پال نے اسے کالی کی پوجا کے طور پر پیش کیا، اسی طرح چتورنجن داس ویشنوزم سے متاثر تھے اور انھوں نے اپنی نظموں میں اسے اسی طرح پیش کیا ہے۔ سبھاش چندر بوس، جو رام کرشن سے متاثر تھے، وہ ہر تحریک کو ان کے افکار سے ملا دیتے ہیں۔ وہیں سوامی ویویکانند ویدانتا کے فلسفہ کو نیشلنزم کے ایجنڈے کے طور پر پیش کرتے تھے۔[۵۹] ان وجوہ سے بھی بہت سے مسلمانوں نے خود کو آزادی کی تحریکات سے وابستہ کرنے میں احتیاط سے کام لیا۔ایک اور سبب مسلم خواتین کا تعلیم یافتہ نہ ہونا ہے، جس کے سبب وہ سیاسی، سماجی اور معاشی شعور سے بے بہرہ تھیں۔مزید یہ کہ بے جا پردہ اور کم عمری میں شادی بیاہ جیسی سماجی رسموں کی وجہ سے بھی وہ کمزور ہو جاتی تھیں۔اس کے باوجود بنگال کی مسلم خواتین نے تحریک آزادی ہند کے ہر مرحلے میں نمایاں خدمات انجام دیں، مختلف جلسوں جلوسوں میں حصہ لیا، بڑے بڑے احتجاج کیے، انگریزوں کے چھپے ہوئے ہتھیاروں اور ان سے متعلق خبروں کا سراغ لگایا اور ان کی اطلاع آزادی کے متوالوں تک پہنچائی۔اپنی ان سرگرمیوں کی پاداش میں انھیں انگریزوں کے تشدد کا نشانہ بننا پڑا، ان میں سے بہتوں کو جیل کی صعوبتیں برداشت کرنی پڑیں اور بعض تو اس راستے میں اپنی جان کی قربانی دیتے ہوئے شہید بھی ہو گئیں۔

---

[۵۸] Anwar Hossain, *Muslim Women's Struggle in Colonial Bengal (1873-1940)*, p:227.

[۵۹] *Ibid*, pp:230-31.
Roy, Rajat Kanta, *Social Conflict and Political Unrest in Bengal (1875-1927)*, Oxford University Press, Delhi, 1984, p:177.

شبلی نعمانی کی تصنیف ''سوانح مولانا روم'' میں تصور روح

ہادی احمد بیگ

ریشی پورہ بڈگام، کشمیر

hadiahmad9797@gmail.com

جلال الدین محمد بلخی(۱۲۰۷۔۱۲۷۳ء) پوری دنیا میں رومی کے نام سے مشہور ہیں۔ان کا شمار دنیا کے چند قدآور شعراء میں ہوتا ہے؛ایک عظیم شاعر ہونے کے علاوہ وہ ایک بڑے عالم دین، معلم اخلاق اور ایک مثالی صوفی ہونے کے شرف سے متصف ہیں اور ایسی نابغہ روزگار ہستی ہیں جس نے اپنے فکر و نظر کے ذریعے عالم ہستی کے سربستہ و عمیق اسرار کی نقاب کشائی کرنے کی کوشش کی ہے۔

مثنوی معنوی جسے مثنوی مولانا روم کے نام سے شہرت حاصل ہے ان ہی سربستہ رازوں،افکار و نظریات اور تعلیمات کا ایک گنجینۂ معانی ہے۔مولانا نے مثنوی اور اپنے دیوان غزلیات جو دیوان شمس تبریزی کے نام سے معروف ہے ایک تخلیقی و فنی پیرائے میں عالم ہستی و اسلامی تعلیمات کی حقیقت کی بازیافت کرنے کی ایک بے مثال سعی کی ہے۔

انسان کے لئے ابتدا ہی سے ایک بڑا سوالیہ نشان ہے کہ وہ کہاں سے آیا، کہاں ہے،اور کہاں جانا ہے، یعنی انسان اپنی وجہ تخلیق اور عالم ہستی کی علت تخلیق کو جاننا چاہتا ہے۔انسان یہ سمجھنا چاہتا ہے کہ وہ کون عظیم ہستی ہے جو اس کائنات کی خالق ہے اور یہ کہ روح کیا ہے اور روح کی حقیقت و ماہیت کیا ہے، یہ اور ایسے دوسرے سینکڑوں سوالات مولانا کی توجہ کا مرکز بنے۔ مثنوی کے طول و عرض میں روح کے متعلق ایسے دقیق اشارات ملتے ہیں جو روح کی اصالت ،ماہیت اور واقعیت کی عقدہ کشائی کرتے ہیں۔روح کا مسئلہ اسلامی عقائد کے اہم مسائل میں شمار ہوتا ہے۔اس مسئلے کی اہمیت معاد کے عقیدے کے حوالے سے کافی اہم مانی جاتی ہے کیوں کہ اگر روح کا وجود تسلیم نہ کیا جائے تو معاد کا اثبات نہیں ہو سکتا۔ حقیقت میں سارے مذہبی نظام کی اساس کا مدار اسی مسئلے پر ہے۔وجود باری تعالیٰ، ثواب و عقاب وغیرہ کا اذعان روح کی واقعیت تسلیم کرنے سے ہی ممکن ہے۔اسی بنا پر مولانا نے روح کے مسئلے پر بہت زیادہ زور دے کر مختلف مواقع پر روح کی حقیقت و ماہیت، حالت اور خواص سے بحث کی ہے۔روح کے تیئں اہل علم کی رائیں مختلف ہیں، حکمائے طبیعین کا نظریہ ہے کہ روح کسی مستقل اصالت کی حامل

نہیں ہے بلکہ عناصر کی ترکیب سے جو خاص کیفیت و مزاج پیدا ہوتا ہے روح اسی کا نام ہے[۱]۔ مغربی دنیا کے بہت سے حکما و فلاسفہ کا نظریہ ہے کہ جسم کی ترکیب کے سوا انسان میں اور کوئی چیز نہیں ہے اسی سے وہ افعال سرزد ہوتے ہیں جن کو لوگ روح کے خواص و افعال سے تعبیر کرتے ہیں۔ اس کے برعکس افلاطون اور دیگر فلسفیوں کا نظریہ ہے کہ روح ایک جوہر مستقل ہے جو بدن سے بطور آلہ کے کام لیتا ہے ، بدن کے فنا ہونے سے اس کی ذات میں کوئی نقصان و فرق نہیں آتا البتہ آلہ و اوزار (اعضائے بدن) کے نہ ہونے سے جو وہ کام کرتا تھا وہ رک جاتا ہے[۲]۔ معروف فلسفی بو علی سینا، نامور عالم دین و حکیم امام غزالی اور دوسرے صوفیہ و حکمائے اسلام کا یہی عقیدہ و نظریہ ہے اور مولانا بھی اسی کے قائل نظر آتے ہیں۔ روح کے گو اور بہت سے خواص و اوصاف ہیں جن کی بنا پر وہ اور چیزوں سے ممتاز ہے لیکن اس کا سب سے بڑا خاصہ قوت ادراک ہے ، مولانا کے بقول روح در حقیقت ادراک کا ہی نام ہے ، جہاں تک قوت ادراک کی بات ہے تو اس کے مراتب میں بڑا فرق ہے کیوں کہ روحانیت کلی طور پر بڑی متنوع ہے یہ بعض افراد میں کم اور بعض میں شدید ہوتی ہے اس حوالے سے مولانا فرماتے ہیں[۳]:

اقتضای جان چو ای دل آگہی ست — ہر کہ آگہ تر بود جانش قوی ست

(جان کا اقتضا جب ادراک ہے تو جو زیادہ ادراک کا مالک ہے اس کی جان (روح) زیادہ قوی ہے)

جان نباشد جز خبر در آزمون — ہر کرا افزون خبر جانش فزون

(روح ادراک کے سوا اور کوئی چیز نہیں ہے اس لئے جس میں ادراک زیادہ ہے اس میں روح بھی زیادہ ہے)

روح را تاثیر آگہی بود — ہر کرا این بیش للّٰی بود

(روح کی تاثیر ادراک ہے اس لئے جس میں یہ زیادہ ہو (روح) وہ خدائی آدمی ہے)

روح کے خواص و اوصاف ، اصالت و ماہیت کیا ہیں اور تفاعل کیا ہے مولانا اس بارے میں بڑے دیدہ رس و دلچسپ نکات پیش کرتے ہیں۔ ان کے بقول روح ایک جوہر مجرد ہے جو جسمانیت سے بالکل منزہ ہے۔ اس کا تعلق جسم سے نہیں بلکہ اس روح حیوانی سے ہے جو انسان میں موجود ہے اور یہ تعلق اس

---

[۱] شبلی نعمانی، سوانح مولانا روم، دار المصنفین شبلی اکیڈمی اعظم گڑھ، یو۔پی، ۲۰۰۳، ص ۱۱۰۔۱۱۷۔

[۲] ماخذ سابق ص ۱۱۰۔۱۱۷۔

[۳] ماخذ سابق ص ۱۱۰۔۱۱۷۔

قسم کا ہے جس طرح آفتاب کا آئینے سے، آفتاب اپنی جگہ موجود ہے، پرتو افگن ہے لیکن اس کا عکس آئینے پر پڑ کر اس کو روشن و منور کردیتا ہے۔ اسی طرح روح عالم ملکوت میں ہے اور اس کا پرتو روح حیوانی پر پڑتا ہے جس کی بدولت انسان محیر العقول اور عجیب و غریب مظاہر و قویٰ کا مظہر بن جاتا ہے۔ بقول مولانا:

جسم سایہ سایہ سایۂ دل است جسم کے اندرخور پایہ دل است

(جسم روح کے سائے کا سایہ ہے اس کو دل سے کیا نسبت)

در ہوای غیب مرغی می پرد سایہ او بر زمین می گسترد

(ہوا میں ایک پرندہ اڑتا (روح ملکوتی) ہے اور اس کا سایہ زمین پر پڑتا ہے)

جان نہان اندر خلا ہمچو سنجاف تن تقلب می کند زیر لحاف

(روح خلا میں سنجاف کی طرح مخفی ہے اور بدن لحاف کے نیچے کروٹیں بدلتا ہے)

مرد خفتہ روح او چون آفتاب در فلک تابان و تن در جامہ خواب

(جب آدمی سو جاتا ہے تو روح آفتاب کی طرح آسمان پہ چمکتی ہے اور بدن شب خوابی کے کپڑوں میں لپٹا ہوتا ہے)

مولانا کے نقطۂ نظر سے ہم روح کی کنہ تک نہیں پہنچ سکتے، روح کیا ہے، کیسی ہے بالخصوص کیا ہم روح کا دیدار ان اپنی مادی آنکھوں سے کر سکتے ہیں؟ مولانا کے مطابق یہ امر محال ہے:

روح من چون امر ربی مختفی است ہر مثالی کہ بگویم منتفی است

(میری روح خدا کے امر کی طرح مخفی ہے روح کی جو مثال بھی دی جائے سب پوچ ہے)

روح مولانا کے بقول ایک ترقی پذیر مخلوق ہے، روح اعلیٰ سے اعلیٰ مدارج طے کر سکتی ہے اور مراتب عالیہ پہ فائز ہو سکتی ہے۔ روح کی ترقی کے مراتب رفتہ رفتہ اور سلسلہ بہ سلسلہ بڑھتے جاتے ہیں یہاں تک کہ اس کا ایک ایسا درجہ آتا ہے جو عام روح انسانی سے اسی قدر عظیم اور بالاتر ہے جس قدر انسانی روح حیوانی روح سے، روح کا یہ عظیم مرتبہ ولایت و نبوت اور عقول مجردہ کا مرتبہ ٹھہرتا ہے اور یہی مراتب عالیہ نظام عالم کے انتظام و انصرام پر مامور ہیں:

غیر فہم و جان کہ درگاو و خراست آدمی را عقل و جان دیگر است

(انسان کی عقل و روح اس ہوش حواس سے بالکل مختلف جو ایک گاے یا خر میں ہوتا ہے)

باز غیر عقل و جان آدمی ہست جانی در نبی و در ولی

(انسان کی وہ اصلی وعالی مرتبہ روح حاصل وکسب کر جو ایک نبی اور اس کے جانشین میں ہوتی ہے)

روح وحی از عقل پنہان تر بود زانکہ او غیب است و او زان سر بود

(درجہ وحی پر فائز روح عام انسانی وعقل کے احاطے میں نہیں آسکتی ہے، کیوں کہ
روح وحی عالم غیب وعالم سر کی ہمراز ہے)

این ہمہ بہر ترقی ہای روح تا رسد خوش خوش بمیدان فتوح[۴]

(روح اعلیٰ سے اعلیٰ مراتب کو مسخر کرتی رہے گی اور روح ان مراتب کو پانے کے لئے خلق کی گئی ہے
بالآخر روح مراتب عالیہ کے میدان فتح الفتوح میں اپنی کمندیں ڈالتی ہیں)

مجموعی طور پر مولانا کے نزدیک روح جوہر مجرد ہے اور انسان میں جو روح حیوانی ہے جس کو جان بھی کہتے ہیں اس کے کام کرنے کا ایک آلہ ہے، جس طرح کاریگر ایک اوزار کے بغیر کام نہیں کر سکتا روح بھی اس روح حیوانی کے بغیر کام نہیں کر سکتا، اور روح متعالی کو فنا نہیں چونکہ وہ جوہر مجرد ہے یعنی نہ مادہ ہے نہ مادہ سے مرکب ہے۔ انسان دراصل اسی ملکوتی روح کا نام ہے اور یہ دنیاوی جسم اور روح حیوانی اس کا قالب ہے۔

---

[۴] مولانا رومی، مثنوی معنوی، انتشارات دوستان، تہران، ۱۳۹۲ ہجری شمسی۔

عبدالرحیم خانِ خانان کی یادداشت اور مہر سے مزیّن تفسیر کشاف کا مخطوطہ

ڈاکٹر عارف نوشاہی

ادارۂ معارف نوشاہیہ، اسلام آباد

naushahiarif@gmail.com

راقم السطور اس سے قبل اکبر بادشاہ کے سپہ سالار اور وزیر اعظم عبدالرحیم مخاطب بہ خانِ خانان (۹۶۴-۱۰۳۶ھ/۱۵۵۶-۱۶۲۶ء) کی یادداشت اور مہر سے مزیّن دو مخطوطات پر مضامین پیش کر چکا ہے، [۱] موجودہ مضمون اس سلسلے کی تیسری کڑی ہے۔ سابقہ دو مضامین میں خان خانان کے کتب خانے، کتاب دوستی، معارف پروری اور دستیاب مخطوطات پر اس کی یادداشتوں سے متعلق معلومات بہم پہنچائی گئی ہیں، یہاں تکرار سے بچتے ہوئے خان خانان کی یادداشت اور مہر سے مزیّن ایک اور مخطوطے کو زیر بحث لاتے ہیں۔

یہ جار اللہ محمود بن عمر خوارزمی زمخشری (وفات: ۵۳۸ھ) کی عربی تفسیر الکشّاف عن حقائق التنزیل کا مخطوطہ ہے جسے اختصار سے اور عرف عام میں تفسیر کشّاف یا صرف کشّاف بھی کہتے ہیں۔ یہ نسخہ اسلامیہ کالج یونیورسٹی لائبریری، پشاور کے ذخیرۂ غلام جیلانی (نمبر ۵۲) کی ملکیت ہے۔[۲] اسلامیہ کالج لائبریری کے دو واجب الاحترام فہرست نویسوں نے اس نسخے کے تعارف میں جو لکھا ہے پہلے وہ پیش کیا

---

[۱] ''عبدالرحیم خان خانان کی مہر اور یادداشت سے مزیّن تاریخ محمود شاہی کا ایک مخطوطہ''، مشمولہ: پنجاب میں فارسی ادب اور فارسی ادب سے متعلق دیگر مقالات، عارف نوشاہی، مجلس ترقی ادب، لاہور، ۲۰۱۸ء ص ۴۹-۵۵؛ ''عبدالرحیم خان خانان کی یادداشت اور مہر سے مزیّن کنزالعمال کا ایک مخطوطہ''، مشمولہ: مطالعات ادب فارسی، عارف نوشاہی، ادارۂ معارف نوشاہیہ، اسلام آباد، ص ۱۱۵-۱۳۲

[۲] مولانا حافظ غلام جیلانی (تیرہویں صدی ہجری) محلہ آسیا، پشاور کے رہنے والے تھے۔ نادر و نایاب مخطوطات جمع کرتے تھے۔ ۱۲۸۸ھ میں سفر حج کے دوران نادر و نایاب کتب جمع کر کے لائے۔ ان کی وفات کے بعد ان کا ذخیرۂ مخطوطات اسلامیہ کالج، پشاور کو عطیہ کر دیا گیا۔ مولوی عبدالرحیم اور ڈاکٹر احمد خان نے ان کے ذخیرے کی فہرست تیار کی ہے جس کا ذکر آگے آئے گا۔

جاتا ہے:

۱۔ مولوی عبدالرحیم: قلمی، خوش خط، باریک قلم نوشتہ ۸۶۶ھ مطابق ۱۴۶۱ء، جو نسخہ کتب خانہ ہذا میں موجود ہے وہ مصنف علام کے اپنے ہاتھ کے لکھے ہوئے نسخے کی نقل ہے۔ دارالسلطنہ احمد آباد میں شہنشاہ اکبر کے شاہی کتب خانے اور نیز دوسرے شاہی کتب خانوں میں یہ نسخہ رہا۔ اکبر بادشاہ کے وزیر اعظم اور سپہ سالار عبدالرحیم خان خانان نے اپنے قلم سے ۹۹۲ بمقام جونپور [کذا] اس کے پہلے صفحے پر ایک طویل عبارت لکھنے کے بعد اپنے دستخط کیے ہیں۔ جدول اور بعض سرخیاں طلائی ہیں لیکن رنگ شوخ نہیں ہے۔ یہ کتاب ۱۰۳۴ھ میں دو سو روپیہ پر ہدیہ کی گئی۔(۳)

۲۔ ڈاکٹر احمد خان: یہ نسخہ ہر پہلو سے مکمل ہے، خط نسخ میں لکھا ہے۔ نقطے لگے ہیں، بعض جگہوں پر اعراب بھی لگا ہے۔ چوکھٹا سنہرا ہے، حاشیے پر وہ آیات ہیں جن کی تفسیر کی گئی ہے۔ آیات کو سرخ روشنائی سے لکھا ہے اور ان پر اعراب لگے ہیں۔ نسخے کی کتابت ذوالحجہ ۸۶۶ھ میں مکمل ہوئی، یہ نسخہ بہت اہم ہے اس لیے کہ تصحیح شدہ نسخے سے نقل ہوا ہے اور کئی شاہی کتب خانوں میں رہا ہے جن کی مہریں اس پر موجود ہیں، مثلاً شاہ عالم اور قابل خان خانہ زاد شاہ عالمگیر، اور ان کی طرف سے ''عرض دیدہ شد'' کی عبارت بتاتی ہے کہ یہ نسخہ ان کی نظر سے گزرا ہے۔ عبدالرحیم خان خانان بن محمد بیرم نے ۹۹۲ھ کے مہینوں میں اس کا مطالعہ کیا ہے، ۶۹۲ ورق۔(۴)

اس نسخے کی خصوصیت یہ ہے کہ اس کے ظہر (سرورق) پر خان خانان کے قلم سے ایک عربی یادداشت اور اس کی مہر ثبت ہے۔ خان خانان کی یادداشت کے اوپر ایک اور فارسی یادداشت ہے جس میں اس نسخے کی سرکار خاصہ کے کتب خانے میں داخلے کی تاریخ اور مقام درج ہے۔ جس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ نسخہ محرّم ۹۹۲ھ میں احمد آباد میں داخل کتب خانہ ہوا۔ اس صفحے پر کئی جگہوں پر مرمتی چپیاں لگی ہوئی ہیں جس کے وجہ سے یادداشتوں اور مہروں کی عبارتوں کو مکمل طور پر پڑھنا آسان نہیں رہا۔ قراءت متن کے

---

(۳) عبدالرحیم، لباب المعارف العلمیہ فی مکتبہ دارالعلوم الاسلامیہ، مطبع آگرہ اخبار، آگرہ، ج ۱، ص ۱۶

(۴) احمد خان، فہرست المخطوطات العربیۃ فی باکستان، جلد ۲، ۳، ۴، مطبوعات مکتبۃ الملک فہد الوطنیۃ، ریاض ۲۰۰۵ھ، ص ۳۲ (مسلسل شمار ۲۹)

دوران جہاں جہاں کاغذ کی چپی لگی ہے وہاں ہم نے تین نقطے ڈال دیئے ہیں یا قیاس سے کام لیتے ہوئے پڑھنے کی کوشش کی ہے۔ قیاسی متن بریکٹ کے اندر درج ہے۔ چونکہ کتب خانے میں داخلے والی یادداشت کے اوپر عبدالرحیم بن محمد بیرم کی مہر ثبت ہے اس لیے اس کے آخر میں ''مالکہ و صاحبہ'' کا مشار الیہ وہی ہو سکتا ہے۔ عربی یادداشت جو خان خاناں کے اپنے قلم سے ہے، اس میں تفسیر کشّاف کے اس نسخے کے داخل کتب خانہ ہونے پر خوشی کا اظہار کیا گیا ہے، تفسیر کے لیے تعریفی جملات ہیں اور اس کے مطالعہ سے مستفید ہونے کی دعا کی گئی ہے۔ دونوں یادداشتوں کا سال ۹۹۲ھ (۱۵۸۴ء) ہے۔

پہلی یادداشت:

تفسیر کشّاف...(بتاریخ) شہر محرم الحرام سنہ ۹۹۲ (در) دارالسلطنہ احمد آباد در کتابخانۂ سرکار خاصہ داخل شدہ۔ مالکہ و صاحبہ

ترجمہ: تفسیر کشاف محرم الحرام کے مہینے، سال ۹۹۲ھ کو دارالسلطنت احمد آباد میں سرکار خاصہ کے کتب خانے میں داخل ہوئی۔ اس کا مالک اور صاحب۔

دوسری یادداشت:

الله اکبر

زيَّن اللهُ الكريمُ سبحانه بيتَ كتبي /بإدخالِ هذا التفسيرِ العربيِّ الذي /كشَف قِناعَ الشُّبَهِ عن وجوهِ ... أبكارِ المعاني المتداوَلة/ (في) القرآن العظيم. وفَّقني اللهُ تعالى لمطالعتِه، والعملِ بما فيه من الأوامر، /والانتهاءِ عما هي من النواهي، بمنّه وكرمِه.كتبه المقصِّرُ في المستحَبَّات /عبدُ الرحيم ابن محمد بيرم عُفِي عنهما/ في شهور سنة ۹۹۲.

ترجمہ:

اللہ اکبر

خدائے کریم نے اس عربی تفسیر کو داخل کر کے میرے کتب خانے کو زینت بخشی، جس نے قرآن مجید کے اچھوتے مفاہیم کے چہرے سے شکوک و شبہات کی نقاب ہٹائی، اللہ تعالی اپنے فضل و کرم سے مجھے اس کے مطالعے ، اس کے اوامر پر عمل کرنے اور نواہی سے باز رہنے کی توفیق عطا فرمائے۔ مستحبات میں کوتاہ، عبدالرحیم بن محمد بیرم عفی عنہمانے یہ تحریر سنہ ۹۹۲ کے مہینوں میں لکھی۔

مہریں:

نسخے کے سرورق پر چار مہریں ثبت ہیں۔اوپر والی دو مہروں کا کچھ حصہ مرمت والے کاغذ کے نیچے دب چکا ہے، باقی دو مُہروں کو سیاہی گہری یا کم رنگ ہونے کی وجہ سے پڑھنا دشوار ہے۔ جو کچھ پڑھا جاسکا وہ یہ ہے:

۱۔ سب سے اوپر والی مہر،اس میں صرف لفظ ''غوث'' پڑھا جاتا ہے۔اس کے علاوہ بھی ایک لفظ ہے۔

۲۔ اس کے نیچے عبدالرحیم خان خاناں کی مہر ہے،اس میں ''عبدالرحیم بن محمد بیرم ۹۹۱'' کندہ ہے۔ یہ وہی مہر ہے جو ہمیں تاریخ محمود شاہی میں بھی نظر آتی ہے جس پر راقم السطور کا علیحدہ سے مضمون چھپ چکا ہے۔

۳۔ تیسری مہر میں اوپر لفظ ''حق'' پڑھا جاتا ہے۔

۴۔ چوتھی مہر میں ''علی شاہ عالم گیر'' کے علاوہ جو الفاظ ہیں وہ پڑھے نہیں جاتے۔اس مہر کے نیچے ''مقرر (یا بتقرر) دو صد روپیہ'' لکھا ہے۔ مولوی عبدالرحیم مرحوم نے اسی یادداشت سے یہ مطلب اخذ کیا ہے کہ یہ کتاب دو سو روپیہ میں ہدیہ کی گئی!

ڈاکٹر احمد خان نے اس نسخے پر دیگر مہروں: شاہ عالم اور قابل خان خانہ زاد شاہ عالم گیر اور اسی کی تحریر ''عرض دیدہ شد'' کا ذکر بھی کیا ہے[۵]۔ یہ مہریں اور تحریر سرورق پر تو نہیں ہے، ممکن ہے کسی اور صفحے پر ہوں۔ راقم السطور کو چونکہ اس نسخے کے صرف سرورق (ظہر) کی تصویر حاصل ہوئی ہے جس پر خان خاناں کی مذکورہ یادداشت اور چار مہریں ہیں، اس لیے ڈاکٹر احمد خان کی ذکر کردہ دیگر مہروں اور ''عرض دیدہ شد'' والی عبارت کے بارے میں کچھ کہنے سے قاصر ہے۔

اظہار تشکر: تفسیر کشّاف کے متعلقہ صفحے کا عکس جناب شارق خان (لاہور) نے مہیا کیا اور خان خاناں کی عربی تحریر کی قراءت اور ترجمہ اور ڈاکٹر احمد خان کی عربی فہرست کا اردو ترجمہ جناب محمد اجمل اصلاحی (دہلی) نے کیا۔ان احباب کی اس عنایت پر سپاس گزار ہوں۔

---

(۵) ماخذ سابق۔
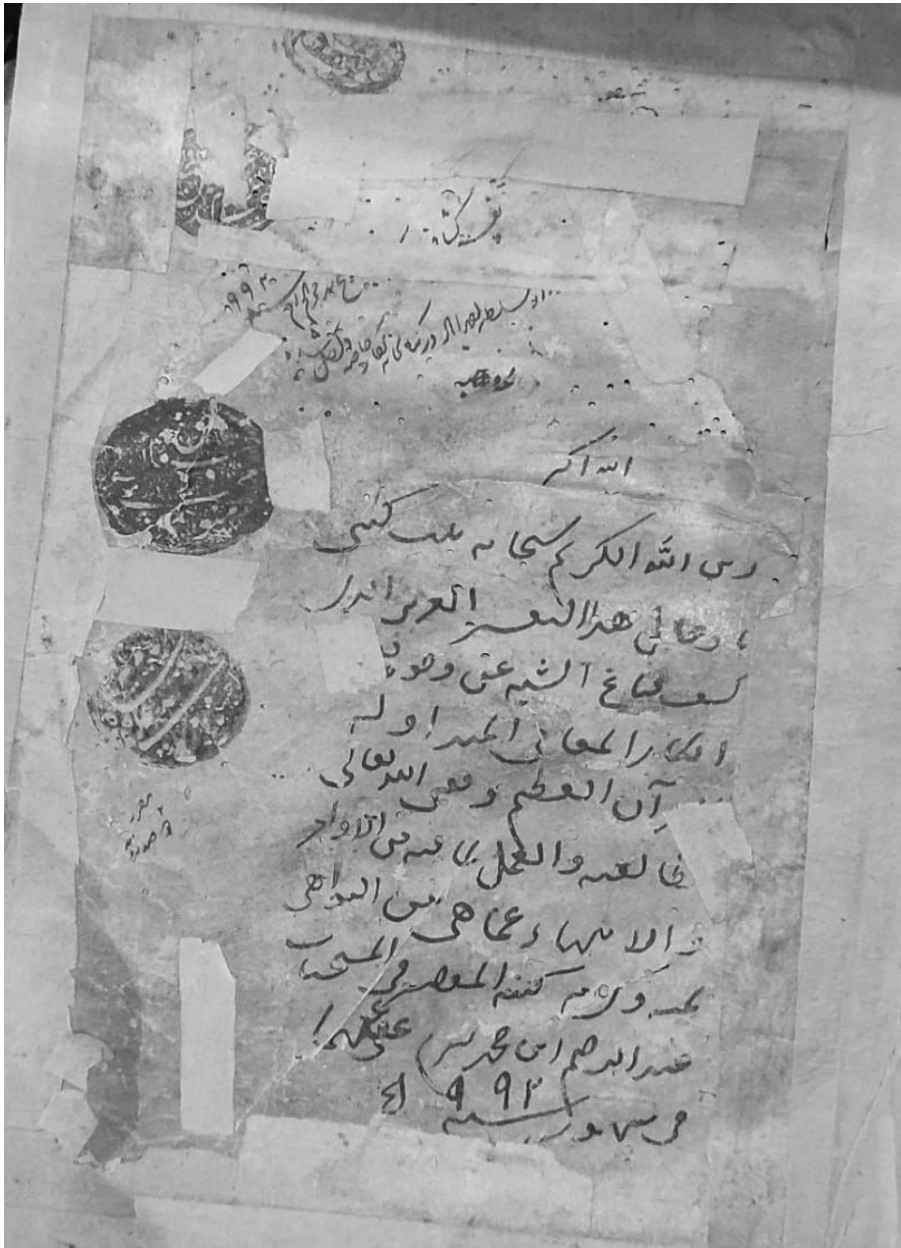
اسلامیہ کالج یونیورسٹی پشاور، ذخیرۂ غلام جیلانی، (شمارہ ۵۲)

عبدالرحیم خان خاناں کی یادداشت اور مہر

اخبار علمیہ

قطبی بر اعظم میں ایک عجیب و غریب چیز کی دریافت

سائنس دانوں کو انٹارکٹیکا کے ساحل کے تحقیقی سفر پر ایک سمندری مخلوق ہاتھ آئی ہے جس کی اس سے پہلے کبھی شناخت نہیں ہوئی تھی۔ دریافت شدہ مخلوق عجیب و غریب اور غیر معمولی شکل کی حامل ہے۔ اس کے ۲۰ بازو ہیں۔ عام طور پر، انٹارکٹیکا جانے والے سائنسدانوں کا مقصد ''پرومکورینس'' یا ''انٹارکٹیکا کے پروں والے ستاروں'' کے نام سے معرف جانوروں کے متعلق تحقیق و جستجو اور معلومات حاصل کرنا ہوتا ہے۔ سمندری مخلوقات کے ساتھ مماثلت کے باوجود ''پرومکورینس'' کو تیراکی کے اپنے غیر معمولی انداز اور بڑے سائز سے پہچانا جاتا ہے۔ یہ ۶۰۰ فٹ تک کی گہرائی میں رہ سکتا ہے۔ سائنسدانوں کو ''پرومکورینس'' جانداروں جیسی ۴ اور نامعلوم انواع ملیں، جن کے ڈی این اے اور حیاتیاتی ساخت کا تجزیہ کر کے اس کی حقیقت کا پتہ لگانے میں ماہرین مصروف ہیں۔ (صحیفۃ الوطن بحرین ۱۳ اگست ۲۰۲۳، صفحہ ۲۰)

۳ لاکھ سال پرانی انسانی نسل کی کھوپڑی پر نئی تحقیق

چین، اسپین اور برطانیہ کے محققین کی ایک بین الاقوامی ٹیم کو ۲۰۱۵ء میں مشرقی چین میں ہوالونگ ڈونگ کے علاقے میں ایک کھوپڑی ملی تھی جس کا نچلا جبڑا اور آنکھوں کے ساتھ ۱۵ اعضاء اس دور سے متعلق ہیں جس کا آغاز تقریباً ۳ لاکھ سال پہلے ہوا تھا۔ "سی این این" کی رپورٹ کے مطابق ۳ لاکھ سال پرانی اس انسانی نسل کی کھوپڑی پر نئی تحقیق سے یہ بات سامنے آئی ہے کہ یہ کسی دوسرے انسانی فوسل (قدیم حجری عہد) سے مختلف ہے جو انسانی نسل کے خاندانی شجرہ میں ایک نئی شاخ کی دریافت کی نشاندہی کر سکتی ہے۔ جریدے ''ہیومن ایوولوشن'' میں شائع اس تحقیق سے انکشاف ہوا ہے کہ ۱۲ یا ۱۳ سال کے بچے کا نچلا جبڑا جسے ''6H L D'' کہا جاتا ہے کسی دوسرے موجودہ درجہ بندی گروپوں کے ساتھ فٹ نہیں بیٹھتا۔ تحقیق کے مطابق، چین میں اس عہد سے متعلق دریافت ہونے والے ''ہیومینائڈز'' کے بہت سے فوسلز کی درجہ بندی کرنا بھی مشکل تھا جن کو پہلے ''غیر معمولی کیسز'' کے طور پر دیکھا جاتا تھا۔ (صحیفۃ الوطن بحرین ۱۲، اگست ۲۰۲۳، صفحہ ۱۶)

ک، ص اصلاحی

وفیات

آہ! جناب الطاف احمد اعظمی مرحوم

(۱۹۴۲ء-۲۰۲۳ء)

افسوس نامور عالم و حکیم، ادیب و شاعر اور طبیب جناب الطاف احمد اعظمی نے اس دنیا کو الوداع کہہ دیا۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔ اکیاسی سال کی عمر اور اس کی قدر کی توفیق بھی پائی۔

وہ اعظم گڑھ کے ایک گاؤں بھاٹن پارہ میں پیدا ہوئے، مدرسۃ الاصلاح میں تعلیم پائی، بعد میں مسلم یونیورسٹی کے طبیہ کالج سے سند حاصل کی، مدرسہ اور یونیورسٹی دونوں جگہ اپنی جانب توجہ مبذول کرائی، طبیب ہوئے تو جونپور میں مطب کھولا، طبابت کے ساتھ قلم و قرطاس کی بھی خدمت کرتے رہے، ان کی کئی کتابوں کے ناشر ہونے کی حیثیت سے جونپور کے مرکز تحقیقات و اشاعت علوم قرآن کا پتہ ملتا ہے۔ بلدہ عطور و بخور جونپور ہی سے ان کی تصنیفی صلاحیتوں کی خوشبو پھیلی تو حکیم عبدالحمید صاحب ہمدرد دواخانہ نے ان کو جامعہ ہمدرد کے لیے بلایا یوں الطاف صاحب دلی کے ہو گئے اور اس طرح ہوئے کہ اس کی خاک کا حصہ بننے سے پہلے کئی اعلیٰ علمی و تعلیمی عہدوں پر فائز ہوئے۔

الطاف صاحب کے علمی درجات ان کے تعلیمی منازل سے ہمیشہ وابستہ رہے، مدرسۃ الاصلاح نے مطالعہ فراہی سے رشتہ مسلسل مضبوط رکھا تو علی گڑھ نے سرسید اور اس سے زیادہ فکر سرسید سے تعلق کو استواری بخشی۔ اور ان دونوں کا اثر و ثمر تھا کہ مطالعہ کے لمحات میں اقبال و شبلی بھی ان کی فکر میں شریک ہو گئے۔ ان دونوں مشاہیر پر ان کی کئی کتابیں قابل مطالعہ ہیں۔ رہی شاعری تو شاید یہ شہر میر وغالب کی وہ سوغات تھی جو ان کے اصل احساسات کے اظہار کا ذریعہ بن گئی۔ لیکن حقیقت یہی ہے کہ فکر و نظر کا اصل سرچشمہ ان کے لیے ہمیشہ قرآن حکیم رہا، سورہ فاتحہ کا تحقیقی مطالعہ اور تجلیات حق میں وجود خدا کا اثبات جیسی کتابیں ہوں یا مولانا فراہی کے بنیادی افکار کا مطالعہ ہو یا انوار قرآن کی شکل میں ان کے قرآنی مقالات کا مجموعہ یا مولانا آزاد کی قرآنی بصیرت کا جائزہ ہو، حتی کہ اقبال پر اظہار خیال ہو، ہر جگہ ان کے مطالعہ کا مرکز یا عمود قرآن مجید ہی رہا، اس مطالعہ کی انتہا یہ رہی کہ انہوں نے میزان القرآن کے نام سے تفسیر ہی لکھ دی، ان کے ہاں تجدید یا تجدد کا جابجا اظہار ہوتا رہا ہے، یہ محض جدت نہیں تھی، دیکھا جائے تو وہ فکر فراہی ہی کے قائل اور اسی پر عامل رہے۔ انہوں نے نظم قرآن اور نظام قرآن کی معروف فراہی شناختوں کو علم مناسبت سے تعبیر کرنے میں شاید اسی احساس جدیدیت سے کام لے کر

کہا کہ علم مناسبت محض ایک غیر ثابت شدہ علمی نظریہ ہے، اس علم کو نظم قرآن کی بدیہی حقیقت ثابت کرنے میں مولانا فراہی کو اولیت حاصل ہوئی۔ تفسیر بالروایت اور تفسیر ماثور کے سلسلے میں انہوں نے صاف لکھا کہ مولانا فراہی تفسیر ماثور کی اہمیت کو تسلیم کرنے کے باوجود اس کو واحد طریقہ تفسیر نہیں سمجھتے تھے، کہ اس سے تدبر فی القرآن کا دروازہ بند ہو جاتا ہے۔ مولانا فراہی کا رسالہ فی ملکوت اللہ خاص طور پر ان کی توجہ کا مرکز تھا، اس کا اردو ترجمہ بھی انہوں نے کیا، لکھا کہ مولانا فراہی کی دینی فکر میں توحید کو مرکزی حیثیت حاصل ہے، ظاہر ہے اس دعویٰ میں کسی بھی مفسر کو مستثنیٰ نہیں کیا جا سکتا لیکن الطاف صاحب نے اس دعویٰ کے اثبات میں جو لکھا وہ پڑھنے کے لائق ہے۔ اس کے متعلق بھی باوجود اپنی معروضیت کے وہ لکھتے ہیں کہ مولانا فراہی عالم اسلام کے پہلے اور واحد عالم ہیں جنہوں نے اس موضوع سے تعرض کیا۔ اسی وجہ سے وہ مولانا فراہی کے بنیادی افکار پر مزید کام کی اہمیت ظاہر کرتے رہے اور شاید اسی موضوع کی اہمیت نے جمہوریت و اشتراکیت، سرمایہ داری اور ریاست جیسے موضوعات پر اسلام کے حوالے سے بہت کچھ لکھوالیا۔ علامہ اقبال کے بنیادی افکار کے مطالعہ میں یہی جذبہ کارفرما نظر آتا ہے۔ اقبال کے فکر و فلسفے پر کہا جاتا ہے کہ نسبتاً کام کم ہوا ہے اور جو ہوا ہے اس میں معروضیت کی بے حد کمی ہے، معروضیت کے لفظ کا اظہار شروع میں شاید کسی معنی کی خبر دیتا تھا، لیکن بعد میں ہر کس و ناکس کے لیے یہ لفظ بطور فیشن زیادہ استعمال ہوا۔ الطاف صاحب کے ایک جملہ نے فیصلہ کر دیا کہ غالب کے بعد اقبال دوسرے بڑے شاعر ہیں جن کی شاعری کی تفہیم فکر و ادراک کے بغیر ممکن نہیں اور اس کی وجہ وہ فکر و فلسفہ ہے جو ان کی منفرد اور متنوع شاعری میں روح رواں بن کر شامل ہے۔ الطاف صاحب جن راہوں کے مسافر تھے ظاہر ہے تصوف سے کسی نہ کسی موڑ پر سامنا ہونا تھا، وہ خود سے سوال کرنے لگے کہ تصوف کیا ہے؟ اور بات جب وحدۃ الوجود کی آئی تو انہوں نے اس کو غیر اسلامی نظریہ کہنے میں تاخیر نہیں کی، اور یہ ان کے مزاج کے عین مطابق ہی کہا جائے گا، ان کے کئی نظریات اور خیالات سے عالمانہ اختلاف کیا گیا لیکن اختلاف ان کے مطالعہ اور اس کے سلیقہ مندانہ اظہار سے کبھی نہیں رہا۔

معارف میں وہ برسوں سے لکھتے آئے، ان کے مضامین کی فہرست خاصی طویل ہے، معارف کو ان کی تحریروں کا انتظار رہتا تھا کہ ان کی تحریروں سے موضوعات پر مطالعہ کو وسعت دینے کا حوصلہ ملتا تھا، قتل عمد میں قصاص اور دیت کے موضوع پر ان کی ایک تحریر کئی نہایت بلند پایہ تحریروں کے وجود کی محرک بن گئی۔ اسی طرح شعر العجم پر ان کے ایک طویل مقالہ نے ان کی شبلی شناسی کا قابل اعتبار اعلان

کر دیا، معارف سے ان کی محبت بڑھتی ہی گئی، شبلی واقبال کے علاوہ ابن الہیثم، ابن رشد اور سر سید پر ان کی بڑی وقیع تحریریں معارف کے صفحات کی زینت میں اضافہ کرتی گئیں۔ ان کا غالباً آخری مضمون تحقیق کے بنیادی اصول اور تاریخ طب کے عنوان سے ۲۰۲۱ء میں شایع ہوا۔ اس سے پہلے سر سید کی تفسیر اور مذہبی فکر پر بھی ان کے مقالات شایع ہوئے۔ ۲۰۲۱ء میں ہی دارالمصنّفین نے ان کی کتاب سر سید ایک تحقیقی مطالعہ کے نام سے شایع کی، سر سید کی کتابوں کا یہ مطالعہ دارالمصنّفین کے فکر واسلوب کی بھی بڑی خوبصورت نمائندگی کرتا ہے۔ سر سید کی تعریف میں ایک جگہ ان کا قلم گویا عالم رقص میں پہنچ گیا، لکھا کہ سر سید اپنے جذبات وخیالات کے اظہار کے لیے جو پیرایہ بیان اختیار کرتے ہیں اس میں دریا کا سا تموج اور آتش بے دود کی سی حدت ملتی ہے۔ وہ اپنی قوم کے غم میں خود بھی جلتے ہیں اور دوسروں کو بھی اسی آگ میں جلنے کی دعوت دیتے ہیں۔ سر سید پر اس کتاب کی خوبی یہ بھی ہے کہ یہ اعظمی صاحب نے عمر کے اس دور میں لکھی جب اعتدال وتوازن کی خوبیاں دوسرے عناصر پر غالب آجاتی ہیں۔

الطاف صاحب شاعر بھی تھے۔ ان کے اشعار کے تین مجموعے شایع ہوئے، ''فغان نیم شب''، ''چراغ شب گزیدہ'' اور ''زنجیر غزل'' ۱۹۱۶ء میں چراغ شب گزیدہ شایع ہوئی تو الطاف صاحب نے اپنے تخلص احمد کے ذریعہ زندگی کی اس کہانی کی جانب اشارہ کر دیا جو علم وفضل کی محفل میں سنائی نہیں جاتی ہے اور پڑھی تو بالکل نہیں جاتی: بہت ہی مختصر ہے احمد خستہ کا افسانہ دریدہ لالۂ صحرا چراغ شب گزیدہ ہے۔

فغان نیم شب اور چراغ شب گزیدہ میں پندرہ برس کا فرق ہے، لیکن اگر اشعار سے زندگی کی رفتار کا اندازہ لگایا جائے تو اس عرصہ میں اعظمی صاحب کے لیے گویا زمانہ پرت در پرت کہیں سے کہیں لے گیا جہاں سچائیاں خود اپنا تعارف کرنے لگتی ہیں۔

بستی میں کوئی شخص بھی اب معتبر نہیں ... سایہ بھی آدمی کا یہاں بدگمان ہے
پھیلائے جب بھی میں نے پر وبال زندگی ... دیکھا زمیں ہے نہ کوئی آسمان ہے

یہاں ان کی شعری خوبیوں کے ذکر کا محل نہیں، لیکن عالم وناقد پر شاعر کس طرح غالب آسکتا ہے یہ کوئی اس مجموعہ کلام سے پوچھے۔

الطاف صاحب کے اخلاق اور اوصاف بیان کرنے کا حق تو ان کو ہے جنھوں نے ان کے ساتھ کچھ وقت گزارا ہم جیسے تو یہی کہہ سکتے ہیں کہ: احمد خستہ گیا دنیا سے آج سب کی آنکھوں کو بہت نم کر گیا۔

اللہم اغفرلہ وارحمہ

محمد عمیر الصدیق ندوی

تبصرہ کتب

• **عالمی تہذیب کو اسلام کا عطیہ:** از ڈاکٹر محمد انوار الحق تبسم، متوسط تقطیع، عمدہ کاغذ و طباعت، مجلد صفحات ۱۷۶، قیمت: ۲۷۵روپے، سال اشاعت ۲۰۲۲ء، پتہ: ایجو کیشنل پبلشنگ ہاؤس، ایچ، او، ڈی ۱/۱۶ انصاری روڈ، نئ دہلی۔ ۲ اور دہلی، علی گڑھ، الٰہ آباد، ممبئی، پٹنہ، کولکاتا، حیدر آباد، اعظم گڑھ کے مشہور مکتبے۔ مصنف کا موبائل: ۷۸۲۷۳۰۸۰۶۳، ایمیل: anwar.balsar@gmail.com

انسانی تہذیب کی ترقی ہر عہد میں ہوئی ہے اور اس میں دنیا کی تمام قوموں نے حصہ لیا ہے مگر تہذیبوں کی عمر، عہد کی عمر سے زیادہ ہوا کرتی ہے، عہد مٹ جاتا ہے، تہذیب باقی رہتی ہے، یہی زمانے کے لیے نقشِ راہ کا کام دیتی ہے، جب مطالعہ کی روشنی ایسے پہلوؤں کو سامنے لے آئے تو پھر آسان، سادہ اور کسی حد تک غیر مرتب زبان و اسلوب میں بھی مضمون کس درجہ دلکش اور دل نشیں بن جاتا ہے، اس کی عمدہ مثال یہ کتاب ہے۔ عنوان ہی کچھ انفرادی شان لیے ہوئے ہے، اسلام نے عالمی تہذیب کو کیا دیا؟ موجودہ دور کے بہت سے سوالوں میں تہذیبوں کا وجود بلکہ ان کے تصادم کا یہ سوال بڑے شد و مد سے اٹھایا جاتا ہے۔ پوری کتاب اسی سوال کا وہ جواب ہے جو یورپ یا اسلام مخالف عناصر کے لیے ان ہی کے میزان عقل و خرد کے عین مطابق ہے۔ فاضل مصنف، تاریخ کے ماہر اور استاذ فن ہیں، ڈاکٹر قیام الدین احمد جیسے فاضل مؤرخ کے شاگرد ہیں، اس لیے ان کے تاریخ کے جدید رمز شناس ہونے میں شبہہ نہیں، وہ پورے یقین سے بحث کی بنیاد اس دعویٰ پر رکھتے ہیں کہ حضور ﷺ کی وفات کے بعد اسلامی سلطنت کی توسیع کے ساتھ ایک نئی تہذیب کی بھی بنیاد پڑی، جو دنیا کے کسی حصہ کی تہذیب سے بہتر و برتر تھی۔ مورخین اس تہذیب کو اپنے لحاظ سے مختلف نام دیتے رہے، اسلامی، عربی، سیر اسین وغیرہ اس کو مخلوط تہذیب بھی کہا جا سکتا ہے جس میں مختلف مذہبوں اور ملکوں اور قوموں کی خوبیاں بھی رچ بس گئیں، مصنف کی تائید بھی اسی خیال کے حق میں ہے کہ یہ ایک رنگا رنگ تہذیب تھی، جس کی زبان عربی اور مذہب اسلام تھا۔ اس کے بعد اسلام کی ضرورت، نبوت محمدی ﷺ اور اساس دین، عورتوں کا مقام جیسے ذیلی عنوانوں کے تحت، دین اور تہذیب کے رشتوں پر عمدہ گفتگو کی گئی ہے۔ عقیدہ توحید کا ایک مقصد تمام انسانوں کو ایک ذات سے وابستہ کرکے کنبہ کے افراد کو بھائی بھائی بنانا بھی ہے، اور عقیدہ رسالت مذہبی زندگی کا ایک نیا سلسلہ شروع کرنے کے لیے انسان کی تاریخ کو جوڑتا ہے، توڑتا نہیں، اسلام کے دوسرے عقیدوں میں قربت الٰہی کے علاوہ اجتماعی پہلو پر زیادہ زور ہے، اسلام نے اپنا مطالبہ کم سے کم رکھا اور انسان کو اپنی فطرت اور زمانہ کی ضرورت کا لحاظ رکھنے کے لیے زیادہ سے

زیادہ آزادی دی۔ تہذیب کے مطالعہ میں اس قسم کی بنیادی فکر نے اسلام کے ہر شعبہ کے مطالعہ کی تفہیم کو آسان تر بنادیا۔ اسلامی علوم وفنون میں جہاں تفسیر و حدیث و فقہ کا بیان ہے وہیں تصوف اور تجدید دین کے ساتھ خطاطی، نقاشی، مصوری، موسیقی، فن تعمیر کی نشان دہی کردی گئی، سب سے دلچسپ بلکہ مفید ترین حصہ، تعلیقات کا ہے، جس میں پچاس سے زیادہ ان اشخاص کا ذکر ہے جو کسی نہ کسی حیثیت سے ملت کے وجود میں امتیازی شان رکھتے ہیں، اس طرح یہ کتاب ایک کشکول بن گئی ہے جس میں ضرورت کی ہر شے اپنے وجود کا اعلان کرتی ہے۔ کتاب پر تاثرات عموماً اشاعت کے بعد ظاہر کیے جاتے ہیں لیکن اس کتاب میں یہ جدت بھی ہے۔ شفیع مشہدی نے تاریخی حوالات کا ذکر کیا ہے، حوالات بجائے حوالہ جات جائز ہوسکتا ہے لیکن اپنے عام استعمال کی وجہ سے اس سے دور رہنے میں عافیت ہے۔ یہ کہنا محض رسمی نہیں کہ یہ کتاب سب کے لیے خصوصاً اردو کی نئی نسل کے لیے حد درجہ افادیت رکھتی ہے۔ (عمیر الصدیق ندوی)

• **اثرات شبلی اول، دوم** از ڈاکٹر محمد الیاس الاعظمی، متوسط تقطیع، عمدہ کاغذ و طباعت، صفحات بالترتیب ۲۷۲، ۲۷۲، قیمت ہر جلد ۴۰۰ روپے، پتہ: مکتبہ: جامعہ لمیٹڈ، اردو بازار جامع مسجد، دہلی۔۶ اور مکتبہ دارالمصنفین، سنہ اشاعت ۲۰۲۲ء موبائل: ۹۸۳۸۵۷۳۶۴۵، ایمیل: azmi408@gmail.com

کسی فرد، انجمن، جماعت کے اثرات کا جائزہ لینا اس لحاظ سے بہت زیادہ مشکل نہیں کہ ہر ایک کا ایک دائرۂ عمل اور ایک خاص مقصد کی یافت کا تعین آسان ہوتا ہے، لیکن فرد جب خود انجمن ہو اور کسی ایک جماعت سے کہیں زیادہ اس کا اجتماعی فیضان بے کراں ہو تو پھر یہ جائزہ حوصلہ مندوں کے لیے چیلنج بن جاتا ہے، اس کتاب کے مصنف ایسے ہی حوصلہ مندوں میں ہیں، انہوں نے شبلی کی یاد کو اس طرح سے حرز جاں بنایا کہ اب شبلی کو جی سے بھلایا جانا ان کے لیے ناممکن ہے۔ بے شمار کتابوں کے ذریعہ وہ شبلی کے ہر پہلو کو دیکھنے اور دکھانے کی شاید کبھی ختم نہ ہونے والی دید کا سامان فراہم کرتے رہتے ہیں، شبلی کے شیدائیوں کے لیے اب ان کا نام محتاج تعارف نہیں، زیر نظر کتاب کے عنوان ہی سے ظاہر ہے کہ انہوں نے علامہ شبلی کے افکار و نظریات ان کے اقوال و اعمال سے متاثر بے شمار افراد کا ذکر مع اثر سپرد قلم کردیا، شبلی کے بعد ان کی عملداری کی جہاں گیری کا اعتراف تو بار بار کیا گیا لیکن نام بنام سر سید سے رئیس احمد جعفری تک اور دوسرے حصہ میں ڈاکٹر سید رفیق حسین سے محمد تنزیل صدیقی الحسینی تک سینکڑوں شخصیتوں کا ایسا استقصاء شاید ہی کسی کے ذہن میں آیا ہو۔ مصنف نے صرف اثرات کی نشان دہی ہی نہیں کی جگہ جگہ متاثر ہونے والوں کے تعارف میں اپنا خیال بھی ظاہر کیا ہے۔ مثلاً پروفیسر محسن

عثمانی کے ایک مضمون میں مولانا علی میاں پر شبلی کے اثرات کا ذکر کیا تو الاعظمی صاحب نے لکھا کہ انہوں نے موضوع کا حق ادا نہیں کیا، اسی طرح مولانا سعید الرحمن اعظمی کے ایک مقالہ پر اسی طرح اظہار خیال کرنے کے بعد وہ ان کی اس رائے کا پر زور رد کرتے ہیں کہ مولانا سید عبدالحیؒ حسنی کی رہنمائی علامہ شبلی کے لیے مشعل راہ تھی بلکہ خود شبلی نے نزہتہ الخواطر کے سلسلے میں مولانا کی رہنمائی کی۔ کہیں مدح، کہیں مدافعت اور کہیں اقدام، یہ سب مصنفانہ حقوق ہیں جن کا استعمال بڑی شائستگی اور معقولیت سے کیا گیا۔ سب سے اہم بات یہ ہے کہ قریب تین سو اشخاص کا ذکر آگیا، ان میں سے کچھ تو بالکل فراموش ہو چکے ہیں، شبلی کے اثرات کے طفیل ان کو گویا نئی زندگی ملی۔ مصنف طنز و مزاح نگار نہیں لیکن شہاب الدین دسنوی کی ایک کتاب کے حوالہ سے انہوں نے لکھا ہے کہ ''صرف اس کتاب کی وجہ سے دسنوی صاحب کو دارالمصنّفین کی مجلس انتظامیہ کا ممبر اور بعد میں ادارہ کا سکریٹری بنادیا گیا، آج اگر صباح الدین صاحب اور ضیاء الدین اصلاحی رحمہا اللہ زندہ ہوتے تو علامہ شبلی پر ستائیس کتابیں اور شبلی شناسی کو ملک و بیرون ملک ایک مستقل موضوع قرار دینے کے سبب ناچیز کے ساتھ کیا حسن سلوک کرتے''۔ ان کو احساس ہوا کہ یہ سخن گسترانہ بات ہے۔ اس کے لیے انہوں نے معذرت بھی کر لی۔ حقیقت یہی ہے کہ مصنف اعتراف و قبول کے جس مقام پر ہیں وہاں شکوہ یا جواب شکوہ کی ضرورت ہی نہیں۔ (ع۔ص)

• **معارف کی کہانی، مدیران معارف کی زبانی** از کلیم صفات اصلاحی، متوسط تقطیع، عمدہ کاغذ و طباعت، مجلد مع گرد پوش، صفحات ۲۵۶، قیمت ۲۵۰ روپے، پتہ: اصلاحی ہیلتھ کیئر فاؤنڈیشن، نئی دہلی، اور مکتبہ دارالمصنّفین، اعظم گڑھ۔ سنہ اشاعت درج نہیں۔

رسالہ معارف کی کہانی دراصل دارالمصنّفین کی کہانی ہے۔ دارالمصنّفین جسم ہے تو معارف اس کا چہرہ بلکہ اس کا دل ہے۔ وہ سراج منیر تو یہ وہ شمع جس نے گھر گھر اجالا کیا اور وہ چراغ جس سے کتنے اور چراغ جلائے گئے۔ لائق مصنف اسی شبلی منزل کے ہیں جہاں کے طاق و محراب میں معارف روشن ہے اور اس طرح کہ ایک صدی گزر گئی لیکن جس چراغ کو خون جگر جیسا زیت روز اول سے دیا گیا، اس کی روشنی نہ شرقیہ دیکھتی ہے اور نہ غربیہ، بس روشنی ہی روشنی ہے۔ سو برس میں کتنے رسالے آئے اور گئے لیکن کوئی بات تو ہے کہ معارف کا نام و نشاں اب تک باقی ہے۔ شاید اسی احساس نے لائق مصنف کو معارف کی داستاں سرائی پر آمادہ کیا، ان کا یہ حق بھی واجبی تھا کہ اس سے پہلے انہوں نے دارالمصنّفین کے سو سال لکھ کر اپنے ذوق و شوق کا پتہ دیا تھا۔ بس جدت یہ ضرور کی گئی کہ خود کو قصہ گو نہ سمجھ کر خود معارف کے

مدیروں کی زبانی یہ کہانی تیار کردی۔ جن کی نظر معارف کی فائلوں پر ہے خصوصاً اس کے شذرات کے صفحات جن کی نگاہوں کے سامنے ہیں وہ خوب جانتے ہیں کہ ہر مدیر نے مسلسل معارف کے ذکر کو اس طرح ترجیح دی کہ گویا مستقبل میں دارالمصنّفین اور معارف کی تاریخ کے لیے مواد جمع ہوتا رہے اور جس کی مدد سے ایک ادارہ ہی نہیں ایک ملک ایک قوم اور ایک عہد کی سچی تاریخ لکھنے کے لیے مورخ کو زیادہ پریشانی نہ ہو۔ معارف کا تخیل ظاہر ہے علامہ شبلی کے ملی و قومی جذبات کا نمائندہ ہے لیکن مولانا سید سلیمان ندوی نے جس طرح اس کو رفعتوں کے آسمان میں ہم دوش ثریا کردیا وہ کسی بھی قصہ ہوش ربا سے کم نہیں، ان کے بعد شاہ معین الدین ندوی، سید صباح الدین عبدالرحمن، مولانا ضیاء الدین اصلاحی اور پروفیسر اشتیاق احمد ظلی (داستان ان ہی حضرات کی ہے) جیسے مدیروں کے لیے اس قصہ کی منزلوں کی تلاش کسی امتحان سے کم نہیں تھی۔ یہ سب سرگشتہ خمار رسوم و قیود تھے۔ تیشے بغیر رہ ہی نہیں سکتے تھے۔ ایسے مدیر بھی اردو کی صحافت میں بس شاذ و نادر ہی ملیں گے، لائق مصنف کی یہ جدت تعریف کے لائق ہے کہ انھوں نے بڑی محنت سے سونے کے ٹکڑوں کو جمع کرکے ایک نہایت دیدہ زیب اور بیش قیمت زیور عروس صحافت اردو کے لیے پیش کردیا، انھوں نے خود بھی جابجا اپنے تبصرے اور تاثرات پیش کیے ہیں اس لیے کتاب کا نام معارف کی کہانی کچھ مدیروں اور کچھ اپنی زبانی بھی رکھا جاسکتا تھا، اس داستان میں تحقیق کا بھی لحاظ رکھا گیا، مولانا دریابادی کا ذکر اسی لحاظ سے ہے، فہرست میں بھی سلیقہ نمایاں ہے، توقیت معارف بھی بہت کارآمد ہے، اور ان خوبیوں پر مستزاد نہایت خوبصورت نہایت شستہ، نہایت شگفتہ وہ پیش لفظ ہے جو ڈاکٹر محمد نعیم صدیقی ندوی کے قلم بہار رقم کا نمونہ بلکہ کرشمہ ہے۔ (ع۔ص)

- **تتمہ فتحیہ عبریہ**، تالیف شہاب الدین طالش، ترجمہ ڈاکٹر عطا خورشید، متوسط تقطیع، بہترین کاغذ و طباعت، مجلد مع گرد پوش، صفحات ۱۳۶، قیمت ۳۰۰ روپے، پتہ: براؤن بکس علی گڑھ اور ایجوکیشنل بک ہاؤس اور مکتبہ جامعہ لیمٹڈ، علی گڑھ، سنہ طباعت ۲۰۱۸، موبائل ناشر: ۹۸۱۸۸۹۷۶۷۵

زیر نظر مختصر سی کتاب دراصل ایک نادر مخطوطہ کا اردو ترجمہ ہے، یہ قلمی نسخہ علی گڑھ کے علاوہ کئی اور کتب خانوں میں بھی محفوظ ہے، فتحیہ عبریہ کا اردو اور انگریزی اور فرانسیسی ترجمہ ہوچکا ہے لیکن اس کا وہ حصہ جو تتمہ کے نام سے ہے، بقول فاضل مترجم اس کا مکمل ترجمہ کسی بھی زبان میں اب تک شائع نہیں ہوا۔ اس لحاظ سے زیر نظر کاوش واقعی اہمیت رکھتی ہے، یہ محض انسانی تجسس کی ذہنی تسکین نہیں بلکہ واقعہ ہے کہ ہر جزو اپنی اصل تک پہنچنے کی صلاحیت رکھتا ہے اور اسی لیے اس کی ضرورت بھی ہے۔

مغل دور میں بنگال اور آسام کی کیا حالت تھی اور چار سو سال پہلے دہلی سے ان دور دراز علاقوں کے انتظام کی کیا نوعیت تھی، عام تاریخ کی کتابوں میں ایسے معلومات کم ملتے ہیں لیکن اسی دور میں چھوٹی چھوٹی یادداشتوں یا ذاتی معلومات کے مجموعوں سے کبھی کبھی تاریخ کے آئینہ پر چھائی گرد بڑی آسانی سے صاف کی جاسکتی ہے، اسی لحاظ سے یہ مختصر نوشتہ تاریخ اپنی اہمیت کا اقرار کراتا ہے، مخطوطہ نویس شہاب الدین طالش بنگال کے گورنر میر محمد سعید اردستانی میر جملہ کی فوج میں وقائع نویس کی حیثیت سے شامل تھے، میر جملہ کی زندگی میں جو لکھا وہ فتحیہ عبریہ ہے، ان کی وفات کے بعد جو لکھا گیا وہ یہی تتمہ ہے۔ ترجمہ ظاہر ہے، دشوار طلب تھا کہ وقائع نویس، انشاپردازی کا کمال بھی دکھانا ضروری سمجھتے تھے، تاہم فاضل مترجم اس دشواری سے بہ آسانی گذر گئے۔ اصل چیز وہ بیانات ہیں جن سے اس زمانہ کے مزاج کا اندازہ ہوتا ہے کہ یہ آج سے کچھ زیادہ جدا نہیں تھا، طالش ایک جگہ لکھتے ہیں ''جس شخص کے پاس وسیلہ تھا وہ اضافہ منصب وخدمت کے حصول میں مصروف رہا اور راقم الحروف کی مانند جس نے حرف التجا کسی کے سامنے نہیں رکھا اور اپنی عالی ہمتی کی وجہ سے بے بصیرت نودولتیے حکام کے سامنے سر نہیں جھکایا وہ گم نامی کے غار میں چلا گیا اور الحمد للہ کہ حسن اتفاق سے صرف ایک شخص یعنی راقم الحروف ہی کی قسمت میں ناکامی منحصر تھی''۔ سلاطین اور امراء کے دربار میں قبض وبسط اور تنگی وکشادگی کی دھوپ چھاؤں شاید انسان کی فطرت کی طرح قدیم ہے۔ عوام سے محصول کے نام پر حکومت کی لوٹ کا بھی یہی حال ہے۔ بنگال وآسام بھی اس ظلم سے مستثنی نہیں تھے۔ وقائع نویس لکھتے ہیں کہ یہ اورنگ زیب تھے جنھوں نے ہر باشندہ کو غیر شرعی محصولات اور مطالبات سے معاف و محفوظ کیا اور ایسی رعایتیں دیں جو توران کے سالانہ خراج کے برابر تھیں۔ عوام کا ایسا خیال کسی نے نہیں کیا۔ مغلوں کو بیرونی حملہ آور بتانے والے صرف اس مختصر سی تاریخی دستاویز میں خواجہ مرلی دھر، راجہ اندر رمن، بھگوتی داس دیوان خالصہ، رائے نند لال، دھرم ساہ وغیرہ ناموں اور ان کے مرتبوں کو دیکھ لیں کہ امور حکومت میں مغلوں کی بے تعصبی اور رواداری کا عالم کیا تھا، طالش ایک جگہ رائے نند لال کے بارے میں لکھتے ہیں کہ وہ علم سپاہ گری ودیوانی امانت، راستی، معاملہ فہمی میں وحید عصر ہیں اور ہندی ویونانی حکمت علمی و عملی میں مہارت اور انشا و لعلا کی درستی اور تقریر و تحریرِ فارسی و ہندوستانی میں یکتائے روزگار ہیں بلکہ انتظام و انصرام میں نظام الملک اور صاحب عباد سے آگے ہیں۔ اس چھوٹی سی یادداشت یا ڈائری میں ہندوستان میں مسلمانوں کے نظام حکومت اور اس سے زیادہ اس ملک سے محبت و عقیدت کی کئی کہانیاں ہیں۔ جھوٹ اور الزام تراشی کے شور میں مسئلہ یہ ہے کہ کیسے سنایا جائے ؟ بہر حال اس قیمتی دستاویز کے

حصول اور شاندار ترجمہ کے لیے فاضل مترجم کو دل سے مبارک باد۔ خدا کرے ان کی جانب سے اس قسم کے علمی تحائف اردو کے ذخیرہ کو اور بھی مالامال کرتے رہیں۔ (ع۔ ص)

• **اقوال سلف جلد نہم:** مولانا محمد قمر الزماں الٰہ آبادی، صفحات: ۶۴۸ مجلد۔ ملنے کا پتہ: مکتبہ دار المعارف الہ آباد ۶۳۹/بی وصی آباد، الہ آباد۔ قیمت: درج نہیں۔ سن طباعت: ۲۰۲۰ء موبائل نمبر: ۹۴۵۰۵۸۱۸۰۷۔ ای میل: درج نہیں۔

مشہور عالم و عارف مولانا قمر الزماں الٰہ آبادی نے اقوال سلف کی ترتیب و تالیف کا سلسلہ برسوں پہلے شروع کیا۔ یہ اس قدر مقبول ہوا کہ اس کی نویں جلد منظر عام پر آئی ہے اور ناشر کے مطابق اس کی دسویں اور گیارہویں جلد بھی انشاءاللہ جلد ہی شائقین کے ہاتھوں میں ہوگی۔ اس سے قبل کی تقریباً تمام جلدوں پر تبصرہ ان صفحات میں آچکا ہے۔ زیر نظر جلد میں چودھویں صدی ہجری کے نصف ثانی یعنی ۱۳۵۴ھ سے ۱۳۸۶ھ تک ہند و بیرون ہند کے کل ۸۴ مرحوم بزرگان دین اور علما و فضلا و شعرا کا تذکرہ ہے۔ مولانا اشرف علی تھانوی، مولانا محمد احمد، مولانا شاہ بدر علی، سید محفوظ حسنی مصری، اصغر گونڈوی، علامہ اقبال، سید قطب شہید، مولانا ثناءاللہ امرتسری وغیرہ جیسے اعیان علم و فضل کے مختصر مگر جامع حالات و اقوال کے مطالعہ سے قلب و نظر کو جلا اور زندگی کو توانائی ملتی ہے۔

مولانا سید احتشام ندوی نے اس تذکرے کے متعلق صحیح لکھا ہے کہ "نزہۃ الخواطر کے بعد یہ دوسرا مفصل تذکرہ علمائے اسلام کا ہے ---اردو میں اقوال سلف کی کوئی دوسری نظیر نہیں ہے" (ص ۲۵)۔ مولانا نے جن بزرگوں کے حالات کے لکھنے یا مواد کے حصول میں جن سے تعاون لیا ہے یا جن کتابوں کو اپنا مستفاد بنایا ہے ان کا ذکر بھی کر دیا ہے۔ فاضل مؤلف کی ایک پہچان ان کے مختصر توضیحی حواشی سے ہوتی ہے۔ مولانا مدنی کے اس بیان کہ متصوفین کو قیود شرعیہ اور کتاب و سنت کی حدود میں رکھنا ضروری ہے ورنہ عام مسلمانوں میں گمراہی پھیلے گی (ص ۴۱۴) کے متعلق لکھتے ہیں، اس لیے صوفیہ کو بہت احتیاط کی ضرورت ہے تاکہ ان کے کسی قول و فعل سے بدعت کا شیوع نہ ہو (ص ۴۱۵)۔ لیکن مولانا شاہ بدر علی صاحبؒ کا یہ بیان کہ: ایک مرتبہ جب میں تہجد کے لیے بیٹھا تو اللہ تعالیٰ نے مجھ سے فرمایا: مانگ کیا مانگتا ہے، میں نے عرض کیا: مجھ کو اور میرے تمام مریدین و معتقدین کو بخش دیجیے۔ اللہ تعالیٰ نے اپنے فضل و کرم سے میری دعا قبول فرمائی، بغیر کسی تبصرہ کے نقل کیا ہے (ص ۱۲۵)۔ مولانا کی زبان میں سلاست اور اسلوب میں اس قدر سادگی و دل نشینی ہے کہ قاری کی دلچسپی بڑھتی جاتی ہے اور وہ کتاب ختم کیے بغیر رکھنا نہیں چاہتا۔ کتاب کی افادیت و اہمیت میں شبہہ

نہیں ہے۔امید ہے دوسری جلدوں کی طرح یہ جلد بھی مقبول اور بصد شوق پڑھی جائے گی۔(کلیم صفات اصلاحی)

• **عبادت:** ابو حمود عبد السمیع کلیم اللہ المدنی، مراجعہ صفی الرحمن ممتاز علی دریابادی، کاغذ و طباعت عمدہ، غیر مجلد مع خوبصورت گرد پوش، صفحات ۲۴۶، ملنے کا پتہ: علی احمد عبدالمجید نزد پوروانچل بینک، لڑوامہوا تراہا، بکھرا، سنت کبیر نگر۔ قیمت: درج نہیں۔ سنِ طباعت ۲۰۲۱ء۔موبائل نمبر: ۹۴۵۲۰۹۰۵۹۔ای میل: درج نہیں۔

عام طور سے عبادت کے مفہوم میں پرستش، اطاعت اور غلامی جیسی کیفیات آتی ہیں۔اسلام میں عبادت کی اصل روح توحید کو قرار دیا گیا ہے اور اللہ وحدہٗ لاشریک کے علاوہ کسی کی عبادت جائز نہیں سمجھی گئی ہے۔اس کتاب میں مصنف نے عبادت کی لغوی واصطلاحی تعریف، اس کے اقسام و شرائط وغیرہ پر عقلی اور تحقیقی بحث کے ساتھ غلو کی نشاندہی میں نذر و نیاز، قبروں کے پاس عبادت، غیر اللہ کی قسم، ان سے استغاثہ وغیرہ مضامین بھی دلچسپ انداز میں پیش کرنے کے بعد لکھا ہے کہ شرک کے راستوں اور وسائل کو حرام و ناجائز قرار دینے کا اصل مقصد وحدانیت کی حفاظت وصیانت ہے۔ مصنف نے علم، یقین، قبول، انقیاد، صدق، اخلاص اور محبت کو شرائط توحید میں شمار کیا ہے۔آخری بحث میں نواقض اسلام کا ذکر بھی ہے یعنی وہ کون سے اعمال وافکار ہیں جن کے ارتکاب سے ایک مسلمان دائرہ اسلام سے خارج ہو جاتا ہے۔شرک و عقیدۂ شفاعت، دین کے مقابلہ میں کسی دوسرے نظام کی ترجیح، ارکان اسلام کا استہزا، جادو، سحر پر یقین وغیرہ نواقض اسلام میں ہیں (ص ۲۳۱۔۲۴۰)۔مصنف نے زبان سادہ اور آسان استعمال کی ہے اور مشکل باتوں کو بھی آسان بنادیا ہے۔(ک، ص اصلاحی)

والد کے خطوط بیٹے کے نام: حاجی سید محمد مفیض الدین قادری، کاغذ وطباعت عمدہ، مجلد مع خوبصورت گرد پوش۔ صفحات: ۳۰۴۔ملنے کا پتہ: قادریہ بشریہ اکیڈمی، ککرہ روڈ، غوث نگر قادری کالونی، شاہجہاں پور۔ قیمت: ۳۵۰روپے۔ سن طباعت: ۲۰۲۱ء۔موبائل نمبر: ۹۳۱۹۱۰۹۵۲۴، ای میل: درج نہیں۔

مولانا سید بشیر الدین قادری شاہجہاں پوری اسلامیہ انٹر کالج شاہجہاں پور میں سنسکرت اور تاریخ کے استاذ تھے۔ سنسکرت میں مہارت کے سبب حکومت ہند کی طرف سے انہیں "پنڈت" کا خطاب ملا۔ تاریخ ہندی قرون وسطی کی تین جلدیں ان کا بڑا علمی کارنامہ ہیں جس کی اب تک دوسری جلد ہی منظر عام پر آسکی ہے۔اس کے علاوہ ان کی کئی اور کتابیں بھی ہیں۔

زیر نظر کتاب ان ۱۶۷ خطوط کا مجموعہ ہے جو انہوں نے اپنے بیٹے کے نام لکھے تھے۔مرتب

مکتوب الیہ کے صاحب زادے ہیں۔والد کی خواہش وایما کے مطابق یہ خطوط مرتب کیے گئے اور اس یقین کے ساتھ پیش کیے گئے کہ اردو کے مکتوباتی ادب میں ان سے مفید اضافہ ہوگا۔حالانکہ اب یہ خطوط نگاری بھی ماضی کی یادوں میں ہی رہنے والی ہے جیسا کہ پیش لفظ میں کہا گیا ہے کہ اب یہ فن ہی مردہ ہو چلا ہے۔

زیادہ تر مکاتیب نجی اور ذاتی نوعیت کے ہیں جن میں دین ودنیا کے مسائل اور حقائق کے بارے میں ناصحانہ گفتگو ہے، جہاں ایک باپ کا لہجہ صاف ظاہر ہوتا ہے لیکن یہ بھی ہے کہ ایک مشفق باپ کے ساتھ ایک وسیع المطالعہ عالم اور ایک خوش ذوق انسان اور وقت کی نبض کو سمجھنے والی شخصیت سے بھی تعارف ہو جاتا ہے۔(ک،ص اصلاحی)

• **مضامین یوسف:** ڈاکٹر محمد احتشام الدین خرم، غیر مجلد مع خوبصورت گردپوش۔صفحات:۱۲۸۔ملنے کا پتہ: ڈاکٹر محمد احتشام الدین خرم ۱۱-۳-۸۵۵ نیو میلا پلی، حیدرآباد۔قیمت: ۲۰۰ روپے۔سن طباعت: ۲۰۲۰ء موبائل نمبر: ۹۸۸۵۹۴۴۸۲۸۔ای میل: modfarrukh77@gmail.com

مصنف کتاب ڈاکٹر محمد یوسف الدین کا تعلق حیدرآباد کے اس معروف عربی خانوادہ سے ہے جو محمد بن قاسم سے پہلے ہندوستان آچکا تھا۔آباو اجداد نے تجارت اور علم وفن کی نشر واشاعت کو اپنا پیشہ بنایا تھا۔ڈاکٹر صاحب بھی عالم وفاضل تھے۔عصری موضوعات پر اسلام کے نقطۂ نظر کو پیش کرنے میں مہارت رکھتے تھے۔چند کتابوں کے نام سے اس کا اندازہ کیا جا سکتا ہے جیسے اسلام کے چند معاشی نظریے، قرآنی مصنوعات، اسلامی بینکنگ، اسلامی سلطنت کا برتاؤ غیر مسلم باشندوں کے ساتھ۔ اردو کے علاوہ انگریزی میں بھی لکھتے تھے۔اس ہمہ گیر زبان دانی کا اثر تھا کہ انہوں نے علمی، ادبی، سوانحی، اقتصادی اور ثقافتی موضوعات پر متعدد تحریریں سپرد قلم کیں جن کو اس کتاب میں یکجا کردیا گیا ہے۔ترتیب اگر موضوعاتی یا سنہ وار ہوتی تو بہتر ہوتا۔

اسلام مذہبی تعصب کو سخت ناپسند کرتا ہے، اسلام کا معاشی نظام، حضرت فاطمہ زہراؓ بنت رسولؐ، آصفی حکمرانوں کا انتظام سلطنت، تمدن کی ترقی میں تجربہ کی اہمیت وغیرہ جیسے مختصر مگر مفید مضامین دلچسپ ہیں۔ایک مضمون میں عثمانیہ یونیورسٹی کے سابقہ اردو ذریعۂ تعلیم کو بحال کرنے اور دس کروڑ اردو بولنے والوں کے لیے کم از کم دس اردو یونیورسٹیوں کے قیام کی حکومت سے فرمائش کی گئی ہے (ص ۷۷) علامہ جمال الدین افغانی اور حیدرآباد کے تعلق سے مضمون پر از معلومات ہے۔بیشتر مضامین صدق جدید، رہنمائے دکن، سیاست، مبصر جیسے

اخبارات ورسائل کی زینت بن چکے ہیں۔(ک، ص اصلاحی)

• **ہندوپاک کے مشاہیر کی قرآنی خدمات**، ضیاءالدین فلاحی، پروفیسر خلیق احمد نظامی مرکز علوم القرآن علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ ۲۰۲۰ء، قیمت ۵۰۰، صفحات ۲۳۹

اس کتاب کے تعارف میں لکھا گیا ہے کہ یہ کتاب ''ہندوپاک کے مشاہیر کی قرآنی خدمات دراصل پانچ علمائے امت اور دانش وران قوم کے سات قرآنی تراجم وتفاسیر کا خلاصہ ہے''(ص ۱۴)۔اسی کتاب کا ایک پاکستانی ایڈیشن بھی شائع ہوا ہے جس میں کل دس مشاہیر کی قرآنی خدمات کا جائزہ پیش کیا گیا ہے۔

یہ کتاب ''برصغیر کے فضلاء کی قرآنی خدمات'' نظامی سینٹر سلسلۂ مطبوعات کی ساتویں کتاب ہے۔اس میں سات مشاہیر قرآنی کی قرآنی خدمات کا جائزہ لیا گیا ہے جن کی تفصیل درج ذیل ہے:

۱۔ احسان اللہ عباسی: ترجمۂ قرآن بزبانِ اردو غیر حامل المتن

۲۔ مولانا عبدالماجد دریابادی: تفسیر ماجدی

۳۔ مولانا عبدالماجد دریابادیؒ: Tafsir-ul-Quran (انگریزی)

۴۔ انجینئر خرم مرادؒ: آخری سورتوں کا درس (۱۔۲)

۵۔ مولانا محمد منظور نعمانیؒ: ۱۔درس قرآن اور ۲۔قرآن آپ سے کیا کہتا ہے؟

۶۔ ڈاکٹر اسرار احمدؒ: بیان القرآن

۷۔ مولانا وحیدالدین خاں: تذکیر القرآن۔

احسان اللہ عباسی کے ترجمے کے بارے میں مصنفِ کتاب لکھتے ہیں: ''علامہ عباسی کا ترجمۂ قرآن شستہ و سلیس ہے۔اس ترجمہ کے ذریعے اس کا بھی علم ہوتا ہے کہ بیسویں صدی کی پہلی دہائی میں اردو بالغ ہوچکی تھی۔خود مترجم نے دیباچے میں اس کی وضاحت کی ہے''۔ص(۳۴)

یہ حقیقت ہے کہ آسان زبان میں ترجمۂ قرآن پیش کرنے کی علامہ عباسیؒ نے ایک کامیاب کوشش کی ہے تاکہ مسلمانوں کے علاوہ غیر مسلموں کے لیے بھی یہ ترجمہ مفید ہوسکے۔وہ ڈپٹی نذیر احمد دہلویؒ کے ہم عصر تھے۔

مولانا عبدالماجد دریادیؒ کو علامہ شبلی نعمانیؒ کی اس شدید تمنا کو بروئے کار لانے کا موقع ملا کہ انگریزی میں ایک مستند ترجمۂ قرآن شائع کیا جائے۔اس عظیم کام کے لئے مولانا شبلی نے اپنے زمانے کے دو ممتاز باکمال شخصیات مولانا فراہیؒ اور نواب عمادالملک مرحوم کا انتخاب کیا۔اور بقول علامہ سید سلیمان ندویؒ: ''نواب صاحب کا یہ ترجمہ پندرہ پاروں تک مکمل ہوچکا تھا''۔چند سطروں کے بعد ہی سید

صاحب ۱۶ پاروں تک کے ترجمہ کی بات کرتے ہیں۔ (حیات شبلی، اکتوبر ۲۰۰۰، ص ۴۵۱) اس ضمن میں مولانا عبدالماجد دریابادیؒ کی بات صحیح معلوم ہوتی ہے کہ ان پاروں کی شائع ہونے کی نوبت ہی نہ آسکی۔ وہ لکھتے ہیں: ''۔۔۔اور یہ خدمت قرآنی جو بہت قابل قدر ہوتی اسی منزل پر ناتمام رہ گئی اور شائع ایک پارہ بھی نہ ہو سکا'' (ماہنامہ صبح صادق جنوری ۱۹۵۶ء، ص ۷۰ اقرآن نمبر)۔

مولانا دریابادیؒ اپنے انگریزی ترجمہ قرآن کی خصوصیات کے متعلق تحریر کرتے ہیں:

میں نے پورے قرآن کے ترجمہ میں مسجع و مقفع عبارت سے احتراز کیا ہے۔ میں نے اپنی محدود بساط بھر انگریزی بائبل کے محقق ترجمہ اور اسلوب کی پیروی کی ہے، اگرچہ اس کی بابت اعتماد کے ساتھ نہیں کہا جاسکتا کہ اس میں بھی تحقیق کا اعلیٰ معیار موجود ہے (ص ۸۷)

اس کتاب میں یہ بھی لکھا ہے:

مولانا وحید الدین خاں حفظہ اللہ جو بنیادی طور پر مدرسۃ الاصلاح سرائے میر، اعظم گڑھ کے فارغ التحصیل ہیں، انہوں نے سید ابوالاعلیٰ مودودی اور امین احسن اصلاحی کے علوم و افکار سے بھرپور استفادہ کیا ہے۔ بعد کے زمانے میں اول الذکر کے سیاسی افکار سے فکری اختلاف کیا اور مؤخر الذکر کے طرز اسلوب و منہاج کو آگے نہ بڑھا سکے۔ البتہ اس حسرت کا اظہار کرتے رہے کہ اگر مولانا امین احسن اصلاحیؒ پاکستان کے بجائے مدرسۃ الاصلاح سرائے میر، بھارت میں رہتے تو یہ مدرسہ عالم اسلام میں قرآنیات کا سب سے عظیم مرکز بن چکا ہوتا (ص ۱۸)

مصنف نے اس پر کوئی حوالہ نہیں دیا ہے۔ مولانا وحید الدین خان نے مدرسۃ الاصلاح میں متوسطات (عربی سوم، چہارم) تک کی تعلیم حاصل کی تھی۔ انہوں نے مولانا مودودیؒ سے سیاسی افکار کے بجائے بعض دینی تعبیرات میں اختلاف کیا تھا۔ اسی کے رد عمل میں ان کی کتاب ''تعبیر کی غلطی'' منظر عام پر آئی تھی۔ مولانا مرحوم کی تفسیر کا رنگ مجموعی اعتبار سے دعوتی اور تذکیری ہے۔ اسی بنا پر انہوں نے اس کا نام ''تذکیر القرآن'' رکھا ہے۔ اس میں فلسفیانہ مواعظ تلاش کرنا عبث ہے۔

کتاب کے نام میں مشاہیر کی جگہ چند مشاہیر ہوتا تو موزوں ہوتا، کیوں کہ مشاہیر میں اور بھی معروف مفسرین شامل ہیں۔ بحیثیت مجموعی کتاب لائق استفادہ ہے۔ (فضل الرحمن اصلاحی)

• **ڈاکٹر عابد اللہ غازی، صریر خامہ**، انجمن ترقی اردو (ہند)، دہلی، اشاعت دوم: ۲۰۱۰ء، صفحات ۱۶۰، قیمت ۱۵۰ روپیے

اس کتاب کا نام غالب کے اس مشہور شعر سے مستعار لیا گیا ہے:

آتے ہیں غیب سے یہ مضامیں خیال میں غالب صریر خامہ نوائے سروش ہے۔

زیر تبصرہ کتاب 'صریر خامہ' کا یہ دوسرا ایڈیشن پہلے ایڈیشن سے قدرے مختلف شائع ہوا ہے۔ عناوین پر ایک طائرانہ نظر ڈالنے سے اس کتاب کی اہمیت کا احساس جا گزیں ہو جاتا ہے: زندہ اور مردہ قومیں، مقاصد کا راہی، علی گڑھ کا پیغام۔ آئیڈیل کی تلاش۔ گفتگو اور عمل، لائحہ عمل، صحیح کام انجام دینے کا سلیقہ، اپنی خودی پہچان، مثبت اور منفی طرز عمل، مقاصد کی لگن، قومی ہیرو، چھوٹے چھوٹے کام، ہندوستانی مسلمانوں کے مسائل، ناکامیاں، مثبت اقدار، سعی پیہم، اس سادگی پہ کون نہ مرجائے اے خدا، اگلے وقتوں کے ہیں یہ لوگ، تاریخی ناول اور تاریخی شعور، اور مغربی دنیا میں مسلمان وغیرہ۔

غازی صاحب مرحوم کی جرأت رندانہ کا مشاہد کتاب کے ان چند درج ذیل اقتباسات کے مطالعہ سے کیا جا سکتا ہے:

۱۔ مسلمان ابابیلوں کا انتظار کر رہا ہے، جن کے پنجوں میں کنکریاں ہیں۔ اس کے سارے مسائل کا حل امام مہدی اور حضرت عیسیٰؑ کی آمد میں ہے۔ اس نے چودہ سو سال ان کا انتظار کیا ہے اور چودہ سو سال اور کر سکتا ہے (اس سادگی پہ۔۔ ص ۱۱۹، ۱۱۸)۔

۲۔ وہ (مسلمان) غلیل سے راکٹ کا جواب دے رہا ہے، جلتے ٹائروں سے ٹینکوں کا مقابلہ کر رہا ہے، وہ پھونکوں سے F16 کو اڑا رہا ہے۔ وہ نعروں سے طوفانی یلغاروں کو پسپا کر رہا ہے اور خود کو بھسم کر کے نیوکلیر طاقت کو شکست دے رہا (حوالہ سابق ص ۱۱۸)۔

۳۔ اب وقت آگیا ہے کہ ہم اپنی ترجیحات طے کریں، اور جن لوگوں کو اللہ تعالیٰ نے فکر، علم اور وسائل سے نوازا ہے، وہ ان وسائل کو ان کاموں میں لگائیں، جس سے قوم کا مستقبل سنورے اور دیرپا ادارے تعمیر ہوں (قومی ہیرو ص ۸۰)۔

۴۔ میری ناچیز رائے میں ہمیں پانچ میدانوں میں منظم کوشش کرنی چاہیے:

۱۔ ہماری سب سے اہم ضرورت تعلیم ہے اور ہمیں فوری طور پر تعلیم پر توجہ دینے کی ضرورت ہے۔

۲۔ تعلیم کے ساتھ ہی اہمیت کے لحاظ سے اقتصادی ترقی ہے اور اقتصادی ترقی کے لیے سعی و پیہم کی ضرورت ہوتی ہے۔

۳۔ جمہوریت میں ووٹ دینے اور سیاسی شرکت کی خاص اہمیت ہے ،اور جو سیاسی حقوق ہمیں حاصل ہیں ،ان کا دفاع اور توسع سسٹم میں داخل ہو کر شریک عمل ہونے سے ہی ہو سکتا ہے۔

۴۔ یہ دور ابلاغ اور انفارمیشن کا ہے اور ہمیں اس میدان مین ترقی کا واضح پروگرام بنانا چاہیے۔ ذرائع ابلاغ دنیا کی اہم ترین انڈسٹری ہے اور ہماری آواز کسی گوش سماعت تک نہیں پہنچ رہی۔

۵۔ ہمارا دین ہمیں برابر نیکی اور خیر کے کاموں میں شرکت اور تعاون کی دعوت دے رہا ہے۔۔۔ یہ کام سماجی امور میں مخلصانہ شرکت سے ممکن ہے۔ سماجی خدمت کے جو ادارے کام کررہے ہیں ،اس میں ہماری شرکت اور تعاون خاص اہمیت رکھتا ہے۔

اس ضمن میں ایک موئثر چینی کہاوت کو دل میں اتارتے کی ضرورت ہے: ایک سال کی منصوبہ بندی کرنی ہے تو کاشت کرو، دس سال کے لیے درخت لگاؤاور اگر سو سال کے لیے منصوبہ بندی کرنی ہے تو تعلیمی ادارے قائم کرو (تعلیمی کارواں ، سید حامد بحوالہ ماہنامہ افکار ملی دہلی ، جنوری ۲۰۱۱ء ص ۵۱)۔ بحیثیت مجموعی کتاب لائق استفادہ اور امت مسلمہ کے تیئں کچھ کر گزرنے کے جذبۂ شوق سے عبارت ہے۔ (ف۔ ر۔ ا)

ادبیات

غزل

وارث ریاضی

سکٹا(دیوراج)بسوریا،وایا:لوریا،مغربی چمپارن۔بہار۔۸۴۵۴۵۳۔موبائل:۸۲۲۸۹۰۲۵۴۸

(خمار بارہ بنکوی(۱۹۱۹ء۔۱۹۹۵ء)کی نذر)

وہ کانٹا ہے جو چبھ کر ٹوٹ جائے　　محبت کی بس اتنی داستاں ہے
(خمار بارہ بنکوی)

جبیں میری ہے ، اس کا آستاں ہے　　عجب حسن و جنوں کی داستاں ہے
تو دل میں ہے مکیں، آنکھوں میں رقصاں　　تری یادِ حسیں تسکینِ جاں ہے
بھٹک جاتا ہے منزل پر پہنچ کر　　بہت نادان میرِ کارواں ہے
سیاست نے ہمیں وہ دن دکھائے　　زمیں روتی ہے ، غمگیں آسمان ہے
کہاں انساں جسے انساں کہیں ہم؟　　کہ انساں آج خوں خوارِ جہاں ہے
ملی جس کو وطن کی پاسبانی　　وہ رہ زن ہے کہ میرِ کارواں ہے؟
محافظ قوم کا سمجھا تھا جس کو　　وہی غارت گرِ امن و اماں ہے
اِدھر کھائی اُدھر شیروں کا مسکن　　انہیں کے بیچ میں میرا مکاں ہے
وہ اپنے خاص بندوں پر بھی وارث　　نہ جانے آج کیوں نامہرباں ہے؟

غزل

رئیس احمد نعمانی

نعمانی منزل۔ہمدرد نگر،جمال پور۔علی گڑھ۔۲۰۲۰۰۲

کوئی کافر رفیق راہ ملے　　کچھ تو رازِ دلِ تباہ ملے
ہر طرف ظلم کا اندھیرا ہے　　کیسے بچنے کی کوئی راہ ملے
کیا کرے جھوٹ کی عدالت میں　　کوئی سچّا بھی گر گواہ ملے

جتنے ظالم تھے اور قاتل بھی ۔۔۔ وہ عدالت میں داد خواہ ملے
جب سے دیکھا ہے سوئے گورستاں ۔۔۔ ایک سے سب گدا و شاہ ملے
دے خدا انکسار بھی اس کو ۔۔۔ جس کو دنیا میں عزّ وجاہ ملے
مفت کے سیم و زر سے بہتر ہے ۔۔۔ اپنی محنت سے برگ کاہ ملے
کوئی پہنچا نہ ساتھ منزل تک ۔۔۔ یوں توکتنے شریکِ راہ ملے
دل میں کانٹا سا اب بھی چبھتا ہے ۔۔۔ اک زمانہ ہوا نگاہ ملے
نہ ملا جس کو ڈھونڈتی تھی نظر ۔۔۔ راہ میں کتنے مہر و ماہ ملے

اس جفا گر سے کیا ملیں کہ رئیس
ہم تو خود سے بھی گاہ گاہ ملے

غزل

محمد طارق غازی

وھٹبی۔ کینیڈا

m.tariqghazi@gmail.com

کتاب کھل گئی ہے، اب ہے امتحاں باقی ۔۔۔ گرنتھ روتے ہیں، روئے گی داستاں باقی
وطن میں بکھرے ہوئے منہدم دلوں کے کھنڈر ۔۔۔ دھواں ہے آہوں کا گلیوں کے درمیاں باقی
نگر نگر میں گھروں کو گرائے جاتا ہے ۔۔۔ کہ گھر رہیں نہ رہے شہر کا نشاں باقی
بکھرتا جاتا ہے جو خشت خشت خانہ خراب ۔۔۔ بھلا رہے گا کہاں اس کا پھر مکاں باقی
جو چھت رہی نہ سروں پر تو اس کو بتلا دو ۔۔۔ کل اُس کے سر پہ رہے گا نہ آسماں باقی
فنا کی یہ بھی تو اک بے مراد صورت ہے ۔۔۔ نہ راکھ ہوگی، رہے گا نہ پھر دھواں باقی
الٹ رہا ہے ورق پھر زمانہ ہستی کے ۔۔۔ کہ دوستوں میں ہے بس رنج دوستاں باقی
زمیں کو روند رہے تھے جو کل رعونت سے ۔۔۔ رہا نہ ان کے مقدر میں آسماں باقی
فساد و خوں نے کیا بستیوں کو ویرانہ ۔۔۔ فرشتے مہر بلب، رہ گیا گماں باقی
دلوں سے نکلے مقالوں میں ہوگئے افشا ۔۔۔ نہ دل ہے اب نہ کوئی راز درمیاں باقی

وہی ہیں آج بھی تہذیب کی بقا کا نظام　　نظر جو آتے ہیں قریوں میں کچھ مکاں باقی
یہ حال دیکھا تو اک قول یاد آیا ہمیں　　یقین مٹ گیا دنیا میں ہے گماں باقی
وہ شہسوار کہ ہے پاپیادہ صحرا میں　　وہ اسپ تازی ہے صحرا میں بے عناں باقی
صنم کدوں کے صنم گر بدلتے رہتے ہیں　　یہاں رہے گا مگر ایک آستاں باقی

لگاؤ کیا ہے فلسطین و ہند میں طارق
بس ایک نسبت مذموم ہے وہاں باقی

مضمون نگاروں کے لئے اعلان

۱۔ مضمون صرف ورڈ MS Word پروگرام میں، جمیل نوری نستعلیق فانٹ، پوائنٹ ۱۵ میں بذریعہ ایمیل بھیجیں۔ ایمیل کا پتہ: info@shibliacademy.org

۲۔ اگر مضمون مخطوطہ حالت میں دستی یا ڈاک سے بھیجا جارہا ہے تو براہ کرم کاغذ کے صرف ایک طرف اچھا حاشیہ چھوڑ کر لکھیں اور مضمون کی ایک کاپی اپنے پاس ضرور محفوظ رکھیں۔

۳۔ ہر صفحے کے حوالہ جات اسی صفحے پر نیچے حاشیے پر نمبر وار لکھیں۔

۴۔ آسان اور عام فہم زبان استعمال کریں۔

۵۔ حوالے اس ترتیب سے ہوں: مصنف، کتاب کا نام، ناشر، جگہ، سال، جلد (اگر ایک سے زیادہ جلد ہو)، ایڈیشن (اگر طبع اول کے بعد کا ایڈیشن ہو)، صفحہ، صفحات۔

۶۔ مضمون A4 سائز کے ۶۔۲۰ صفحات کے درمیان ہو اور ہر مضمون اپنی جگہ مکمل ہو۔

۷۔ معارف میں حتی الامکان سلسلہ وار مضامین نہیں شائع کئے جائیں گے۔

۸۔ معارف میں صرف غیر مطبوعہ مضامین و مقالات کو جگہ دی جائے گی۔ کہیں اور چھپنے کے لئے بھیجا گیا مضمون قابل قبول نہیں ہوگا۔

۹۔ نئے مضمون نگار اپنے مضامین کو معارف بھیجنے سے پہلے اپنے اساتذہ یا معتبر اہل علم کو دکھالیں۔

۱۰۔ نئے مضمون نگار اپنے مضمون کے ساتھ اپنی مختصر کوائف نیز پورا پتہ بشمول موبائل اور ایمیل پتہ بھی بھیجیں۔

۱۱۔ ہر مقالے کے ساتھ یہ وضاحت ہو کہ یہ مقالہ پہلے کہیں نہیں چھپا ہے اور اسے چھپنے کے لئے کہیں اور نہیں بھیجا جارہا ہے۔

رسید کتب موصولہ

اخلاق نبوی ﷺ غزوات کے آئینے میں: مولانا انتخاب عالم اعظمی، کتب خانہ نعیمیہ، دیوبند سہارنپور (یوپی)۔ صفحات ۱۷۶، سال اشاعت ۲۰۲۳، قیمت ۲۰۰ روپے، موبائل نمبر: ۹۹۱۸۸۱۶۶۷۰۔

اردو نظموں کا موضوعاتی اور ہیئتی مطالعہ: ڈاکٹر شیخ احرار احمد، بک امپوریم پٹنہ۔ صفحات ۲۷۲، سال اشاعت ۲۰۲۲ء، قیمت ۳۵۰ روپے، موبائل نمبر: ۹۳۰۴۸۸۸۷۳۹۔

اوراقِ زندگی: جلال الدین اسلم، مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، اردو بازار جامع مسجد دہلی۔ صفحات ۲۴۸، سال اشاعت ۲۰۲۳ء، قیمت ۳۰۰ روپے، موبائل نمبر: ۹۸۶۸۳۶۰۴۷۲۔

تاج دار عالم: قاضی عزیز حسن صابری، بلاسم پبلی کیشنز محلہ شاہ ولایت نخاسہ سہارنپور۔ صفحات ۸۷، سال اشاعت ۲۰۲۳ء، قیمت ۱۰۰ روپے، موبائل نمبر: ۹۷۶۰۰۴۰۶۵۱

تنویرات: ڈاکٹر ضیاء الدین فلاحی، بلائنڈ اسکول، قلعہ روڈ شمشاد مارکیٹ، علی گڑھ صفحات: ۳۵۱، سال اشاعت ۲۰۲۳ء، قیمت ۴۰۰ روپے، موبائل نمبر: ۹۸۱۸۸۹۷۵۷۵

ڈاکٹر محمد الیاس الاعظمی بحیثیت مصنف [۳]: شکیل رشید، ترتیب محمد عرفات اعجاز اعظمی، مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، اردو بازار، جامع مسجد، دہلی۔ صفحات ۱۱۲، سال اشاعت ۲۰۲۳ء، قیمت ۱۵۰ روپے، موبائل نمبر: ۹۸۳۸۵۷۳۶۴۵

رشید حسن خاں کے تحقیقی و تدوینی متعلقات: ابراہیم افسر، مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، نزد جامع مسجد، دہلی۔ صفحات ۳۹۶، سال اشاعت ۲۰۲۳ء، قیمت ۵۵۰ روپے، موبائل نمبر: ۹۸۹۷۰۱۲۵۲۸

محمد داراشکوہ۔ ایک صوفی شہزادہ: ڈاکٹر محمد مشتاق تجاروی، فرید بک ڈپو (پرائیویٹ) لمیٹڈ، صفحات ۱۸۳، سال اشاعت ۲۰۲۲ء، قیمت ۲۰۰ روپے، موبائل نمبر: ۹۲۵۰۹۶۳۸۵۸

مدراسے سنیٹڈ دی بگ پارٹیشن (حصہ اول و دوم): ڈاکٹر شائستہ خان، خدابخش اورینٹل پبلک لائبریری، پٹنہ۔ صفحات: پہلی جلد ۴۹۹ اور دوسری جلد ۵۰۰ تا ۹۵۴، سال اشاعت ۲۰۲۳ء، قیمت ہر جلد: ۵۰۰ روپے، موبائل نمبر: ۶۱۲۲۳۷۱۵۰۷

مولانا عبدالسمیع جعفر صادق پوریؒ حیات و خدمات: انظار احمد صادق، بک امپوریم، سبزی باغ، پٹنہ۔ صفحات ۳۶۰، سال اشاعت ۲۰۲۳ء، قیمت ۲۵۰ روپے، موبائل نمبر: ۸۱۰۲۰۶۲۲۵۷

تصانیف علامہ شبلی نعمانیؒ

سیرۃ النبیؐ جلد اول و دوم (یادگار ایڈیشن)	2000/-	موازنہ انیس و دبیر	250/-
سیرۃ النبیؐ (خاص ایڈیشن مکمل سیٹ ۷ جلدیں)	2800/-	اورنگ زیب عالم گیر پر ایک نظر	100/-
مقدمہ سیرۃ النبیؐ	30/-	سفر نامہ روم و مصر و شام	200/-
الفاروق	350/-	کلیات شبلی (اردو)	220/-
الغزالی	300/-	کلیات فارسی (فارسی)	--
المامون	175/-	مقالات شبلی اول (مذہبی)	170/-
سیرۃ النعمان	400/-	مقالات شبلی دوم (ادبی)	70/-
سوانح مولانا روم	220/-	مقالات شبلی سوم (تعلیمی)	170/-
شعر العجم (اول)	250/-	مقالات شبلی چہارم (تنقیدی)	200/-
شعر العجم (دوم)	150/-	مقالات شبلی پنجم (سوانحی)	150/-
شعر العجم (سوم)	125/-	مقالات شبلی ششم (تاریخی)	150/-
شعر العجم (چہارم)	200/-	مقالات شبلی ہفتم (فلسفیانہ)	100/-
شعر العجم (پنجم)	150/-	مقالات شبلی ہشتم (قومی و اخباری)	150/-
مکاتیب شبلی (اول)	150/-	الندوہ (۹ جلدیں)	4735/-
مکاتیب شبلی (دوم)	190/-	اسلام اور مستشرقین (چہارم)	250/-
الانتقاد علی تاریخ التمدن الاسلامی (محقق ایڈیشن) تحقیق: ڈاکٹر محمد اجمل ایوب اصلاحی	350/-	الکلام	250/-
		علم الکلام	200/-
خطبات شبلی	150/-	انتخابات شبلی (سید سلیمان ندوی)	200/-

ISSN 0974-7346 Ma'arif (Urdu) Print SEP 2023 Vol. 210/09

RNI No. 13667/57 MA'ARIF AZM/NP-43/2023-25

Monthly Journal of

DARUL MUSANNEFIN SHIBLI ACADEMY

P.O. Box No: 19, Shibli Road, Azamgarh, 276001 U.P., India

Tel. 06386324437 Email: info@shibliacademy.org

دارالمصنّفین کی چند اہم مطبوعات

سیرت عمر بن عبدالعزیز	مولانا عبدالسلام ندویؒ	100/-
مولانا الطاف حسین حالی کی یاد میں	پروفیسر اشتیاق احمد ظلی	250/-
مطالعات شبلی	״ ״	550/-
حیات سعدی	خواجہ الطاف حسین حالی	400/-
شبلی شناسی کے اولین نقوش	پروفیسر ظفر احمد صدیقی	600/-
شبلی کی آپ بیتی	مرتبہ: ڈاکٹر خالد ندیم	325/-
امام رازی	مولانا عبدالسلام ندویؒ	320/-
حیات سلیمان	شاہ معین الدین احمد ندویؒ	600/-
تذکرۃ المحدثین (اول)	مولانا ضیاء الدین اصلاحیؒ	200/-
تذکرۃ المحدثین (دوم)	״ ״	225/-
تذکرۃ المحدثین (سوم)	״ ״	300/-
محمد علی کی یاد میں	سید صباح الدین عبدالرحمنؒ	120/-
مولانا ابوالکلام آزاد	مولانا ضیاء الدین اصلاحیؒ	240/-
ابن رشد	محمد یونس فرنگی محلیؒ	330/-
تاریخ اسلام (اول و دوم مجلد)	شاہ معین الدین احمد ندویؒ	375/-
تاریخ اسلام (سوم و چہارم مجلد)	״ ״	500/-
تاریخ صقلیہ اول	سید ریاست علی ندویؒ	400/-
تاریخ صقلیہ دوم	״ ״	400/-
اسلام میں مذہبی رواداری	سید صباح الدین عبدالرحمن	250/-
یہود اور قرآن	مولانا ضیاء الدین اصلاحیؒ	150/-
تاریخ ارض القرآن	مولانا سید سلیمان ندویؒ	375/-